"حیاتِ غالب"

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے تفصیلی احوالِ زندگی
اور اُن کی
شخصیت کی نشو و نما

از

شیخ محمد اکرام
ایم۔ اے، ایم۔ آر۔ سی۔ اے۔ ایس، سی۔ ایس۔ پی

قیمت : ——— چار روپے

ناشر

جہانگیر بکڈپو کھاری باؤلی دہلی

مطبوعہ

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

عبدُالرحمٰن چغتائی کے نام

فہرست

عنوان	صفحہ

تمہید

مرزا غالب کو ہمارے ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید اردو نثر نے اُن کے گھر میں آنکھ کھولی۔ اور قدیم اردو شاعری بھی اسی گہوارے میں کھیل کود کر جوان ہوئی۔ لیکن غالب کے احسانات فقط اُردو نظم و نثر پر نہیں۔ فارسی بھی اُن کے گھر کی لونڈی ہے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں ان کا سکہ یکساں چلتا ہے۔

غالب کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے لیکن ان کی اہمیت فقط شخصی اور انفرادی نہیں۔ اُن کا مطالعہ فقط اس لیئے دلچسپ نہیں کہ انھوں نے شگفتہ، دلفریب نثر اور دلگداز آبدار شعر لکھے۔ بلکہ وہ ہمارے ادب میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (مذہب میں امام الہند شاہ ولی اللہؒ اور قوم کی سیاسی تاریخ میں سرسید احمد خاں کی طرح)۔ دوسروں کی طرح اپنے دائرۂ عمل میں انھوں نے قدیم و جدید کا رشتہ جوڑا۔ اور قدیم کے سرچشمہ سے جدید کی آبپاشی کر کے اسے تر و تازگی اور نشو و نما کی طاقت عطا کی۔ مرزا غالب نئی نسل کے محبوب ہیں اور قدیم کی روایات کے بہترین ترجمان۔ اگر ہمارے ہاں قدیم اور جدید کی خلیج کو پُر ہونا ہے (اور قدیم فقط وہ نہیں جو آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے دلّی احمد آباد سے شروع ہوتا ہے بلکہ جس کا سلسلہ بیدلؔ، فیضیؔ، خسروؔ کے واسطے سے مسعود لاہوری تک پہونچتا ہے) تو اس کا ایک بڑا ذریعہ غالب ہوگا۔

غالب کا مطالعہ ہم نے دلی لگاؤ اور ذاتی دلچسپی کی کشش سے شروع کیا تھا۔ لیکن مندرجہ بالا اسباب نے ہماری نظروں میں اس شخصی میلان کو ایک افادی رنگ دیدیا۔

اور ہمیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ایک مصروف سرکاری زندگی کے لمحاتِ فرصت اس باغ کی گل چینی میں صرف کریں۔

ہماری سعی کا ماحصل تین گلدستوں میں مرتب ہوا ہے۔ ایک (جو اصل چیز ہے) غالب کے اردو و فارسی کلام کا انتخاب ہے۔ تاریخی ترتیب سے یہ ارمغانِ غالب کے نام سے ہدیۂ اربابِ ذوق ہوا تھا۔ دوسری پیشِ نظر کتاب ہے حیاتِ غالب۔ تیسرا حصہ تنقیدی ہے۔ جس میں اس مرتبہ طویل اضافے کیے گئے ہیں۔ اور غالب کے فلسفہ اور "دبستانِ دانش" پر زیادہ توجہ کی بنا پر اسے حکیمِ فرزانہ کا نام دیا گیا ہے۔ تینوں کتابوں کا مجموعی نام غالب نامہ ہے۔

اس دفعہ سوانحی اور تنقیدی حصص کو علیحدہ علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کے حجم میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ناگزیر ہو گیا تھا لیکن اس طریقِ کار میں معنوی فوائد اور سہولتیں بھی ہیں اور سوانحی حصے کو جداگانہ ترتیب دینے سے شاید ہم مرزا کی شخصیت کی نشوونما کو زیادہ واضح صورت میں پیش کر سکے ہیں۔

"جدید سیرت نگاری" کے ضمن میں ہماری اصل کشمکش شبلی نامہ تھی۔ غالب کی طبیعت میں شبلی کا پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ نہ تھا اور نہ ہی اُن کے متعلق اس قسم کا مواد ملتا ہے جو شبلی کے متعلق موجود ہے لیکن حیاتِ غالب لکھتے وقت بھی ہم نے "جدید سیرت نگاری" کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا اور کوشش کی ہے غالب کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ ان کی باطنی کشمکش، شخصیت کی نشوونما اور ذہن و جذبات کا ارتقا نظر کے سامنے آ جائے۔

اکرام

حیاتِ غالبؔ

حیاتِ غالب

اکبر آباد

مغلوں کے جاہ و جلال کا اصل گہوارہ شاہجہاں آباد تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان کے فنِ تعمیر کا شاہکار اکبر آباد میں ہے۔ بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی یہی بلدۂ حسن و شعر ہے۔

شاہجہاں کا تاج محل اور غالب کی شاعری، فن کی دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں۔ لیکن دونوں کی تہ میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ تخیل کی سربلندی و لطافت تلاشِ حسن۔ فنی پختگی دونوں میں معراجِ کمال پر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ جب مغلوں کے سامنے خزانوں کے منہ کھلے ہوئے تھے تو ان کے سنہرے خواب اور حسین آرزوئیں سنگِ مرمر کے قیمتی لباس میں جلوہ گر ہوئیں لیکن جب یہ خزانے خالی ہوگئے۔ اور آرزوؤں اور خوابوں پر افسردگی چھا گئی تو ان کا اظہار حسین و جمیل الفاظ اور رنگین و دلگداز اشعار میں ہوا۔

آباؤ اجداد

مرزا غالب خود مغل تھے۔ اور ان کے دادا قوقان بیگ خاں ابن مرزا ترسم خاں ان کے پہلے بزرگ تھے جنہوں نے مرزا کی پیدائش سے پچاس ساٹھ سال پہلے اپنے والد سے کسی بات پر ناراض ہو کر سمرقند کو

الوداع کہا۔ اور ہندوستان میں اقامت اختیار کی۔ مرزا کے دادا کی زبان ترکی تھی۔ یہاں کی زبان سے ایک حد تک بیگانہ نہ تھے۔ لیکن اعلیٰ خاندان کے تھے۔ اس لیئے مناسب منصب حاصل کرتے دیر نہ لگی۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے پاس ملازم ہوئے۔ اور جب ۱۷۵۳ء کے قریب وہ چل بسے تو دہلی پہنچ کر نواب ذوالفقار الدولہ کی وساطت سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور سیر حاصل پرگنہ (پچاسو) اپنی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیئے حاصل کیا۔[1]

مرزا کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں اور عرف مرزا دولہا تھا[2]۔ ان کی شادی آگرے کے ایک معزز گھرانے میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی عزت النساء سے ہوئی۔ وہ پیدا تو دہلی میں ہوئے تھے۔ لیکن جب والد کی وفات کے بعد پچاسو کی جاگیر جاتی رہی۔ تو انہیں تلاش ملازمت کیلئے جابجا پھرنا پڑا۔ پہلے وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے پھر حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں وہ کئی برس تک تین سو سواروں کے افسر رہے۔ لیکن حیدرآباد کی "پرانی خرابی" یعنی خانہ جنگی کے "جھگڑے" میں یہ نوکری جاتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے الور کا قصد کیا۔ وہاں انہیں ابھی کوئی خاطر خواہ ملازمت نہ ملی تھی کہ اتفاق سے ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے اور جو فوج باغیوں کی سرکوبی کے لیئے گئی اس کے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا۔ یہاں انہیں گولی لگی جس سے وہ جاں بحق تسلیم ہوئے[3]۔ اور اس غریب الدیار کو جس کی زیادہ عمر غریب الوطنی میں گذری تھی قبر بھی وطن سے

---

[1] ملاحظہ ہو کلیات غالب فارسی (خط بنام مولوی سراج الدین احمد و دیباچہ مہر نیمروز)

[2] یادگار غالب صفہ۔ — [3] مرزا کے ایک خط میں لکھا ہے "میرا باپ ..... مہاراجہ بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے مجھ کو برائے دوام ملا۔" (ضمیمہ مکتوبات آزاد)

دور ریاست الور کے شہر راج گڑھ میں ملی۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کے تین بچے تھے۔ مرزا غالب۔ مرزا یوسف اور چھوٹی خانم۔ مرزا غالب جن کا پورا نام اسداللہ بیگ خاں اور عرف مرزا نوشہ تھا شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے جس وقت ان کے والد کی وفات ہوئی۔ وہ فقط پانچ سال کے تھے۔ اس کے بعد ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ مرزا نصراللہ بیگ مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبے دار تھے۔ لیکن جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر آگرے پر قبضہ کر لیا۔ تو یہ عہدہ جاتا رہا۔ اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہوا۔ لیکن فخرالدولہ نواب احمد بخش نے جن کی بہن مرزا نصراللہ بیگ خاں سے بیاہی تھیں[۱]۔ اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے اس وقت ان کی دستگیری کی۔ اور انہیں انگریزی فوج میں چار سو سوار کے ایک رسالے کا ایک رسالے کا افسر مقرر کرا دیا۔ نواح آگرہ کے دو سیر حاصل پرگنے سونک اور سونسہ مرزا نصراللہ خاں کی ذات اور رسالے کے اخراجات کے لیے انہیں تاحین حیات تفویض ہوئے۔ لیکن ابھی ایک سال نہ گزرا تھا کہ وہ ایک معرکہ میں ہاتھی سے گر کر وفات پا گئے اور ان کے ساتھیوں نے ان کا مال و متاع خورد برد کر دیا۔ مرزا غالب اس سلسلہ میں خواجہ حاجی اور اس کے برادر نسبتی مرزا افضل بیگ کا جو بعد میں شاہ دہلی کا کلکتے میں سفیر ہوا ذکر کرتے ہیں۔ ان دونوں کو بعد میں حکام انگریزی نے مرزا نصراللہ بیگ کے قرابت داروں اور ورثا میں سے تسلیم کیا۔ لیکن مرزا غالب انہیں فقط اپنے چچا کے ملازم کہتے تھے۔ وہ مولوی سراج الدین احمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] متفرقات غالب (حصہ اول) ص۱

"آخر روزے بود و روزگارے کہ فلاں بیگ (مرزا افضل بیگ) و شوہر خواہرش (خواجہ حاجی) ہر دو در رسالۂ نصراللہ بیگ بیچارہ نوکر بودند اینہا از سہ پشت نمک پروردۂ آبائے منند۔ و آں کافرِ غدار (خواجہ حاجی) پس از مردن عمِ پراگندۂ چند را کہ فلاں بیگ (مرزا افضل بیگ) از آناں بود با خود گرد کردہ نقد و جنس و اسپ و فیل و خیمہ و خرگاہِ عمِ مرا پاک خوردہ" [1]

مرزا نصراللہ بیگ کی وفات پر نواب احمد بخش نے ایک دفعہ پھر اپنے اثر و رسوخ اور حکمت عملی کا زور چلایا۔ انہیں لارڈ لیک کی فتوحات کے بعد فیروزپور جھرکا اور کچھ اور علاقہ حسنِ خدمت کے عیوض اس شرط پر ملا تھا۔ کہ وہ سرکاری انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیں۔ اب مرزا نصراللہ خاں کی وفات پر انھوں نے فیصلہ کرایا کہ چار سو سوار کا جو رسالہ مرزا نصراللہ سے وابستہ تھا وہ توڑ دیا جائے اور اس کی جگہ پچاس سوار کے ایک دستے کا بندوبست کیا جائے جو بشرطِ ضرورت حاضر رہے۔ اور اس کے ساتھ وہ مرزا نصراللہ کے ورثا کی غور و پرداخت کا بھی اہتمام کریں۔ جس کے عیوض میں پچیس ہزار روپے سالانہ جو وہ سرکار کو دیتے تھے۔ معاف کر دیئے جائیں۔ یہ فیصلہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو ہوا۔ اور اس کے مطابق طے پایا کہ نواب احمد بخش پندرہ ہزار روپیہ پچاس سواروں کے دستہ پر خرچ کریں۔ اور باقی دس ہزار اپنے بہنوئی کے ورثا کی نگہداشت پر۔ نواب احمد بخش نے خواجہ حاجی کو جنہیں مرزا غالب اپنے بزرگوں کا پشتینہ ملازم کہتے تھے۔ اور جن کی اولاد انہیں مرزا نصراللہ بیگ کا قرابت دار کہتی ہے۔ پچاس سواروں کے ایک دستے کا افسر مقرر کیا۔ اس فیصلے کے تھوڑے عرصے نواب احمد بخش نے ۷ جون ۱۸۰۶ء کو لارڈ

---

[1] متفرقاتِ غالب ص ۱۰

لیک سے ایک شقہ حاصل کیا جس کے مطابق مرزا نصراللہ بیگ کے ورثہ پر جو رقم خرچ ہوتی تھی وہ دس ہزار کے بجائے پانچ ہزار رہ گئی - اور اس میں سے دو ہزار سالانہ خواجہ حاجی کے - ڈیڑھ ہزار مرزا غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف کے اور ڈیڑھ ہزار مرزا نصراللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنوں کے لیئے مقرر ہوئے - یہ شقہ جس سے پچیس سال تک مرزا غالب بے خبر رہے آگے چل کر ان کی مالی مشکلات کا بڑا سبب ہوا - اس سے نواب احمد بخش خاں نے مرزا نصراللہ خاں کے ورثا کے متعلق اپنی ذمہ داری دس ہزار سے پانچ ہزار کرلی - اور اس میں سے بھی دو ہزار خواجہ حاجی کو دیکر شاید اس سے ساز باز کیا کہ دستہ کے اخراجات بھی انہیں برائے نام دینے پڑیں -

ننھیال مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں " نصراللہ بیگ خاں بہادر میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبیدار تھا - اُس نے مجھے پالا اور یہ بھی صحیح ہے کہ چچا کی وفات کے بعد اس کے وارث ہونے کی بنا پر سرکار انگلشیہ کی طرف سے مرزا کی خود و پرداخت کا انتظام کیا گیا لیکن اُن کا بچپن اپنے چچا کے ہاں نہیں بلکہ اپنے نانا کے ہاں گزرا - مولانا حالی لکھتے ہیں :" مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خانہ داماد اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی "

مرزا غالب کے ابتدائی حالات سے واقف ہونے اور ان اثرات کا مطالعہ کرنے کے لیئے جنہوں نے اُن پر اس زمانے میں اثر ڈالا جب انسانی ذہن ایک لوح سادہ کی طرح اثر پذیر ہوتا ہے - ہمیں ان کی ننھیال پر نظر کرنی چاہیئے - لیکن بدقسمتی سے اس کے متعلق بہت تھوڑی مستند اور معاصرانہ معلومات محفوظ ہیں - البتہ اس اردو خط سے جو مرزا نے اخیر عمر میں منشی شیو نرائن کو لکھا - پتہ چلتا ہے کہ ان کی ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں

سے تھی۔ اور یہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ وہ منشی شیو نرائن مالک مطبع مفید خلائق کو اپنے اور ان کے خاندان کے تعلقات کا حال بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تمہارے دادا کے والد عہد نجف خاں ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی۔ اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میری ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں۔ اور انھوں نے جو کیٹھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں۔ اور وکالت اور مختاری کرتے پھرتے ہیں اور میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان میں تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازہ کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک اور کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

عنفوانِ شباب

مندرجہ بالا اقتباس سے ایک تو اس امر کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کی ننھیال کس قدر متمول تھی اور ان کا سلسلہ کتنا وسیع تھا۔ اور دوسرے غالب کے مشاغلِ شباب کا بھی کچھ پتہ چلتا ہے۔ راجہ بلوان سنگھ جن کا اس خط میں ذکر ہے۔ بنارس کے راجہ چیت سنگھ کے (جن کی وارن ہیسٹنگز سے کش مکش تاریخ ہند کا ایک اہم باب ہے) صاحبزادے تھے۔ لیکن غالب کے سبھی ہمجولی اور ساتھی اس طرح بلند رتبہ اور عالی خاندان نہ تھے۔ بلکہ ان کے ایک بیان سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا کی آزاد روی انہیں بُری صحبت میں بھی لے گئی۔ وہ مہر نیمروز میں اپنے ابتدائی ایام پر تاسف کر کے لکھتے ہیں:

"سینۂ من نفسے داشت بر وے آسانی نسیمے کہ از فسترن زار وزد۔ زبانِ زدہ من اکہ دم جز پر نا بالیست نزدم و بنانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد۔ بیہدہ کوشش من اکہ بار ہاں بشورہ زار فرو ریختیم ؎

با ایں فروغِ گوہر درخشانی نہاد — زیں سال باہ روزِ کرا کمرد روزگار

با فرو فرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن' با فرو مایگاں ہمنشیں و با اوباش ہمرنگ پائے براہ بیرے و زبان بہ بیہودہ گوئے در شکست خویش گرودن را دستیار و در آزار خویش دشمن را آموزگار"

منشی شو نرائن کے نام مرزا نے جو خط لکھا ہے۔ اس میں اپنی شطرنج بازی اور پتنگ بازی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مرزا کی دلچسپیاں انہیں تک محدود نہ تھیں۔ وہ اس وقت جوان تھے ننھیال خوشحال تھی۔ اس لیے عیش و آرام اور لہو و لعب کے سارے وسیلے میسر تھے اور اس پر اضافہ یہ کہ والدین کا سایہ سر پر نہ تھا۔ کوئی خاص روک ٹوک نہ ہوتی۔ نہ تو حافظ کا

شعر بزبانِ حال پڑھتے ہوں گے ؎

شہر یست پُر ز خوباں وز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

اُن کے ایک ابتدائی قصیدے کی تشبیب ہے ؎

آں بُلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار | بودآشیانِ من شکن طرۂ بہار
ہر غنچہ از دمم بفضائے شگفتگی | فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار
ہر جلوہ زارِ من بتقاضائے دلبری | از غنچہ بود محمل نازے بر ہگزار
ہم سینہ از بلائے جفاپیشہ دلبراں | فرہنگ کاروائی بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہدہا | فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرود و شور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

جوانی میں تھوڑی بہت دل لگی ایک عام بات ہے۔ لیکن غالب یہ زمانۂ عمر اس طرح رنگینیوں سے بھرا ہوا تھا کہ معاصرانہ تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ نواب اعظم الدولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"اسد اللہ خاں اسد عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش اکبرآباد جوانِ قابل یار باش، درد مند ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بُردہ ...... بدخاطر متمکن غمہائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ خمکدۂ نیاز"

انسان کو ان گلیوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ جہاں بچپن کے دن گذارے ہوں اور اگر ان گلی کوچوں سے رنگین اور پُر کیف لمحوں کی یاد وابستہ ہو تو ان سے تعلق خاطر اور

بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ مرزا کو بھی آگرے کے گلی کوچے عزیز تھے۔ اور جب ایک دفعہ نواب ضیاءالدین خاں آگرے گئے تو انھوں نے بڑے ولولہ انگیز طریقے سے اپنے "وطن" کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا لکھتے ہیں:-

"..... شادم کہ شوقِ دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر باشما فرستاد تا ہم دریں غربت زادِ شادمانیِ دیدارِ وطن نیز توانم داد۔ زینہار اکبرآباد را بچشمِ کم ننگرند و از راہگذر ہائے آں دیارِ الحفیظ گوئے والاماں سرائے گذرند کہ آں آباد چہ ویراں و آں ویرانہ آباد بازی گاہِ ہیچمدان مجنونے و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خونے ست۔ روزگارے بودے کہ دراں سرزمین جز مہر گیاہ رُستے و ہیچ نہال جز دل یار نیاوردے نسیمِ صبح در آں گل کدہ بہ مستانہ وزیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے کہ رندان راہوائے صبوحی و زہاد پارسایاں را نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرۂ خاک آں گل زمیں را از تن پیاے بودِ بلبشیں و ہر برگ آں گلستاں را از جان درودے بود خاطر نشاں، اماتا گی وقتِ شما را در نظر داشتہ در دو پردہ شورپرسش انگیختہ بود و چشم براہ داشت کہ کسے نویسد و دریغ کہ ہیچ گاہ ننوشتند کہ رخش سنگیں (یعنی اسپ سنگیں کہ در اکبرآباد معروف است) دعائے مرا کہ امداد پذیرفت و دریا بپاسخِ سلامِ من بزبانِ موج چہ گفت؟"

تعلیم مرزا کے عنفوانِ شباب کا بیشتر حصہ کھیل کود اور لہو و لعب میں صرف ہُوا۔ لیکن اتنا غنیمت ہے۔ کہ ان کی تعلیم سے بے توجہی نہیں برتی گئی۔ مرزا کی والدہ خود لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے مرزا

کی تعلیم کا خاص خیال رکھا ہوگا۔ معاصرانہ تذکروں سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے اور مرزا کے اساتذہ میں آگرہ کے دو مشہور مدرسین (نظیر اکبر آبادی اور مولوی محمد معظم) کے نام لیئے جاتے ہیں۔ مرزا کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ علوم مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی منطق، فلسفہ اور علم ہیئت کی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم کے ماتحت علم طب کی تھوڑی بہت واقفیت ہر ذی علم کے لیئے ضروری تھی۔ اور مرزا کی تحریروں اور دوسرے ذرائع سے خیال ہوتا ہے کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے واقف تھے۔ عربی صرف و نحو سے بھی وہ نابلد نہ تھے۔ اور بقول حالی جن نثر کی ردیفوں میں انھوں نے غزلیں لکھی ہیں ان میں شعر گوئی علم عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم سے بھی بڑھ کر جو چیز مرزا کے علم وفضل کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ان کی فارسی زبان اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرت اظہار ہے۔ انھوں نے گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ظہوری کا کلام اور دوسری مستند کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

مرزا غالب کو فارسی سے دلچسپی مولوی محمد معظم کی شاگردی کے زمانہ سے ہی ہو گئی تھی لیکن شاید اس بارے میں ملا عبدالصمد ہرمزد کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں۔ جو ایک پارسی نژاد ایرانی تھا۔ آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد کہلاتا تھا اور مسلمان ہو کر عبدالصمد کے نام سے موسوم ہوا۔ وہ ایران سے بطریق سیاحت ہندوستان آیا۔ اور پھرتا پھراتا سنہ ۱۸۱۰ء کے قریب اکبر آباد وارد ہوا۔ اور دو سال کے قریب مرزا کے مکان پر مقیم رہا۔ بلکہ جب مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی گئے تو وہ بھی ہمرکاب تھا۔[۱]

سلہ مکاتیب غالب صفحہ ۸۲ - سلہ یادگار غالب صفحہ ۱۸۰

ہرمزد کے حالات پر مبہم اور متضاد روایات کی ایک کہر چھائی ہوئی ہے جبکہ حالی کی ایک روایت اور بعض دوسرے قرائن کی بنا پر بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہرمزد کا وجود فرضی تھا۔ اور مرزا نے ان معترضوں کو خاموش کرنے کے لیئے جو انہیں بے اُستاد کہتے تھے اس کا نام گھڑ لیا تھا۔ حالی نے جس کے سامنے موافق اور مخالف دونوں طرح کی روایات تھیں۔ بالآخر یہ رائے قائم کی کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا۔ اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی ۔ ہمارے خیال میں حالی کی رائے اقرب عن الصحت ہے۔ نہ صرف ہرمزد نے غالب کو فارسی زبان کے رموز و آئین سے آگاہ کیا بلکہ یہ آزاد طبیعت سیاح اپنے دل میں مرزا کے حسن قابلیت اور ذہنی استعداد کی ایک گہری یاد لے کر گیا۔ اور جیسا کہ نواب مصطفٰے خان نے حالی سے بیان کیا۔ اس نے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد مرزا کو کسی دوسرے ملک سے ایک خط میں لکھا:-

"اے عزیز چہ کسی! کہ با ایں ہمہ آزادی ہا گاہ گاہ بخاطرمی گذری ۔"

مرزا اپنی تعلیم کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اسکے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحت (خالص) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ابدی اور

اُستاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عہد تھا حقیقت اس زبان کے دلنشین و خاطر نشان ہو گئی [1]۔"

ہرمزد کی صحبت میں مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہو گیا۔ جو عموماً اہل زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح عام ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرزا بھی شروع سے ہی "ہندی زبانانِ فارسی نویس" کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہرمزد کی وجہ سے پارسیوں کے عقائد سے بھی مرزا کی واقفیت بڑھ گئی۔ اور مذہب کے متعلق عام طور پر ایک آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ ہرمزد کے عقائد کے متعلق غالب اور حالی دونوں خاموش ہیں۔ لیکن عجب نہیں کہ وہ شیعہ ہوں اور اپنے خاندانی طریقے کو چھوڑ کر مرزا کے شیعہ ہونے میں (نواب مرزا حسام الدین حیدر کے اثر کے علاوہ؟) ہرمزد کے اثر کو بھی کچھ دخل ہو۔ ورنہ بیدل کے مداح کا شیعیت اختیار کرنا آسان نہیں۔

تذکرہ گلشنِ بے خزاں میں مرزا کی تعلیم کی نسبت ذیل کا اندراج ہے:۔
"غالب واسد تخلص۔ اسد اللہ خاں نام۔ ملقب بمرزا نوشہ۔ از نبائر غلام حسین خان کمیدان۔ قبل اس سے جدّ دہلی (آگرہ) میں ان کی سکونت کا مکان۔ اُستادان باشعور مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اندر ہادی الشعراء (نظیر اکبر آبادی) جو بے نظیر روزگار تھے ان سے تعلیم پائی۔ ایام صبا سے بہ برکتِ انفاسِ متبرکانِ اُستادوں کے مرتبہ علیم پہنچے۔ تب ان کے فکر رسانے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوش گو ہوں جن کے اُستاد ود ہوں۔ چونکہ وہ آستاد

---

[1] ملاحظہ ہو۔ رسالہ ہندوستانی۔ جنوری ۱۹۳۵ء

مر گئے۔ یہ جب دہلی (آگرہ) سے اُدھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔"

یادگارِ غالب میں مرزا کے اُستاد کا نام شیخ معظم لکھا ہے۔ اسی زمانے کے ایک اور مشہور مدرس میر اعظم علی اکبر آبادی کے نام مرزا کا ایک فارسی خط پنج آہنگ میں درج ہے۔ جو غالباً مرزا کے اُستاد نہ تھے۔ لیکن خط میں بڑی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے اور چونکہ میر اعظم علی بڑے عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ عجب نہیں کہ شاگرد نہ ہونے کے باوجود مرزا نے ان سے کسب فیض کیا ہو۔ میر اعظم علی نے ۱۸۰۵ء میں جب مرزا ابھی نو سال کے تھے سکندر نامہ کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ اور ۱۸۴۵ء تک ان کا سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری رہا۔ میر اعظم علی کے سارے خاندان کو فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ ان کے نانا ملا ولی محمد نے مثنوی مولانا روم کی شرح لکھی تھی۔ یہ سب لوگ اور خلیفہ محمد معظم اسی محلے میں رہتے تھے۔ جس میں غالب کا قیام تھا۔ یہ محلہ گلاب خانہ کہلاتا تھا اور آگرے میں فارسی زبان کا بڑا مرکز تھا۔ اس میں کئی مدرسے تھے اور اس علمی ماحول میں نہ صرف غالب کو علم و فن سے لگاؤ پیدا ہوا بلکہ فارسی شاعری سے وہ وابستگی شروع ہوئی۔ جو ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والی تھی۔

مرزا کی تعلیم کے متعلق جو منتشر اندراجات ملتے ہیں۔ ان سے ایک دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرزا کو با ہیانہ فنون کی تعلیم جیسے حاصل کر کے وہ اپنا آبائی پیشہ جاری رکھ سکتے نہیں ملی۔ دوسرے اگرچہ ادبی اور عام درسی علوم سے انہیں اتنی واقفیت حاصل ہو گئی تھی کہ اس کے بعد وہ اپنے مطالعہ اور اہلِ علم کی صحبت سے اس میں اضافہ کر سکے اور مختصر سی بنیاد پر ایک گراں قدر قصرِ ادب تعمیر کر گئے۔ لیکن اس تعلیم کو کسی طرح مکمل نہیں کہا

جا سکتا۔ مرزا کی اگر ابتدائی درسی تعلیم مکمل ہوتی تو وہ ادب اور شعر کے غلط راستوں پر اتنی دیر نہ بھٹکتے۔ اُن کے ابتدائی ادبی رجحانات سے ظاہر ہے کہ اگرچہ مولوی محمد معظم اور ہرمز د کے زیر اثر انہیں فارسی زبان اور بعض فارسی شعراء کے کلام سے واقفیت ہو گئی تھی۔ لیکن مذاق کی وہ تربیت اور اصلاح' جو بعد میں مولوی فضل حق اور نواب مصطفٰے خاں کے اثر صحبت اور عرفی و نظیری اور دوسرے نغز گو شعراء کے کلام کے مطالعہ سے ہوئی' ابھی باقی تھی۔

شادی اور نقل سکونت

مرزا ابھی تیرہ سال کے تھے۔ کہ مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے انکی شادی ہو گئی۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیہ سے جو انھوں نے ۲۵ سال کی عمر سے پہلے کسی محبوبہ کی تعریف میں لکھا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ شادی کو "دام سخت" سمجھتے تھے۔ اور "اڑنے" سے پہلے "گرفتار" ہو جانا انہیں ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کے لیئے یہ شادی ہزار آسانیوں اور برکتوں کا باعث ہوئی۔

مرزا کی شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو نہ صرف جاہ و ثروت کے لحاظ سے دہلی کے ممتاز ترین خاندانوں میں سے تھا۔ بلکہ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ رکھتا تھا۔ غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف تھے جنہیں آزاد نے بہادر شاہ بادشاہ کے بعد ذوق کا سب سے اہم شاگرد شمار کیا ہے۔ اور آب حیات میں متعدد صفحات ان کے متعلق لکھے ہیں۔ معروف کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ وہ شروع میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ پاکیزہ اور مؤثر با محاورہ اشعار پر جان دیتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش کے بھائی فخر الدولہ نواب احمد بخش تھے۔ جنہوں نے ریاست لوہارو و فیروز پور جھرکہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس وقت دہلی کے چوٹی

کے امراء میں سے شمار ہوتے تھے۔

اس خاندان سے روابط پیدا ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا نے آگرہ چھوڑ کر دہلی میں اقامت اختیار کی۔ ایک تو اس سے پہلے ہی نواب احمد بخش نے مرزا نصراللہ خاں کی وفات پر ان کے ورثا کی جن میں مرزا بھی شامل تھے غور پرداخت اپنے ذمے لے رکھی تھی اور اب نواب کی بھتیجی سے ان کی شادی ہو جانے سے مرزا کے تعلقات اس خاندان سے اور بھی قریبی ہو گئے۔ اور انہی تعلقات نے انہیں شادی کے دو تین سال بعد ترکِ وطن پر مائل کیا۔

مرزا پندرہ سولہ برس کے ہوں گے۔ جب انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کی لیکن ان کی ننھیال آگرہ میں تھی اور والدہ بھی زندہ تھیں۔ اس لیئے اس کے بعد بھی وہ آگرے جاتے اور وہاں دیر تک مقیم رہتے۔ چنانچہ انھوں نے منشی شیو نرائن کے خط میں جس پتنگ بازی کا مزے لے لیکر ذکر کیا ہے وہ اٹھارہ اُنیس برس کی عمر کا واقعہ ہے اور یہ ساری داستان آگرے کے متعلق ہے۔

ابتدائی اشعار

غالب نے قیام آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخۂ بھوپالی میں محفوظ ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ اس نسخے کے کونسے اشعار آگرے اور کونسے دہلی میں لکھے گئے آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اُردو شعراء کے دو تذکرے ہیں۔ تذکرۂ سرور اور عیار الشعرا جن میں غالب کو اکبرآباد کا ساکن بتایا گیا ہے۔ لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ اور چونکہ تذکرۂ سرور کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بعد بھی ہوتی رہی۔ اس لیئے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیئے گئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری میں

تذکرۂ سرور کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ بھوپال (منقولہ ۱۸۲۱ء) میں نہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اور کسی دیوان میں نہیں ملتے۔ مثلاً

جگر سے ٹوٹے ہوئے ہو گی ہے سناں پیدا　　دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نیازِ عشق خرمنِ سوز اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط　　کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

محفلِ شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں　　شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام　　جس گذرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ پہنچے ہو　　کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صبا جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اُسے بھی جس کی تمنا مجھ کو　　آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

شمشیرِ صاف یار جو زہر آب دادہ ہو　　وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے　　یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے　　دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش　　اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

ایک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے ۔ رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیئے اسد ۔ ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

مرزا کی خصوصیاتِ شاعری کے متعلق نواب اعظم الدولہ لکھتے ہیں :۔
"در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا بیدل در ریختہ در محاورات فارسی مزد دل
می کند بالجملہ ہر چند طرز خود است۔ و اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں
کردہ رو بہ خیال بندی بیش از بیش نہاد خاطر دارد "
عیار الشعراء میں جو خوب چند ذکا نے اپنے اُستاد شاہ نصیر کی فرمائش پر لکھا۔
غالب کے متعلق ذیل کا اندراج ہے :۔
"مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں
عرف مرزا دولہ نبیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبرآباد
شاگرد مولوی محمد معظم شاعر فارسی ہندی "
اس تذکرے میں دو شعر ایسے انتخاب ہوئے ہیں۔ جو اور کہیں ہماری نظر سے
نہیں گذرے ۔

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے ۔ ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانتا ہے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی ۔ کہ رُوئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

مرزا نے آٹھ نو سال کی عمر میں اردو اور دس گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنا

شروع کر دیا تھا۔ اور غالباً اُن اشعار کا معتدبہ حصہ جنہیں مرزا نے پندرہ بیس سال بعد دیوانِ ریختہ سے حذف کیا۔ آگرے ہی میں لکھا جا چکا تھا۔

ان تذکروں میں سے ایک میں مرزا کے حالات اسد اور دوسرے میں غالب کے تحت درج ہیں۔ مرزا نے تمام فارسی کلام میں غالب تخلص استعمال کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعر گوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے اُردو میں بھی یہ تخلص لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد بالعموم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلص قائم رکھا۔ اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے بعد کی چند اُردو غزلوں میں اسد بھی استعمال کیا ہے۔

قیامِ آگرہ کے اثرات

مرزا کے قیامِ آگرہ کے متعلق معاصرانہ تذکروں اور مرزا کی اپنی تصانیف میں جتنا بھی مواد ملتا ہے اُسے ہم پیش کر چکے ہیں۔ اُس کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا کا قیامِ آگرہ انتہائی عیش و مسرت کا زمانہ تھا اور ان دنوں رنج و الم یا کسی طرح کی مایوسی و بے اطمینانی ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ مرزا کے بالکل ابتدائی ایام کی نسبت، ممکن ہے، یہ خیال درست ہو۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ غالب کے ابتدائی ایام اور ان کی ننھیال کے متعلق مستند معاصرانہ اندراجات تھوڑے ہیں۔ صرف نواب اعظم الدولہ کا بیان اور منشی شیونرائن کے نام مرزا کا خط ہی دو ایسے بیان ہیں جنہیں اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی اشعار اور خطوط مرزا کے بعد کے تاثرات کا اظہار ہیں۔ اور اس لیئے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں کہ جب انسان بڑھاپے کو پہونچ کر اور بالخصوص اس حالت میں جب ابتدائی ایام کے سوا باقی ساری زندگی مایوسیوں اور کلفتوں سے بھری ہوئی ہو، اپنے بچپن اور عنفوانِ شباب پر نظر ڈالتا

ہے۔ تو اسے یہ سارا زمانہ ایک رنگین اور مسرت افزا کہر میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس زمانے کی کلفتیں اور تکلیفیں سب بھول جاتی ہیں۔ اور صرف بے فکری اور عیش و آرام کے نقوش نمایاں ہوتے ہیں۔ جن دو اندراجات کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ وہ ضرور اہم ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا بیان کس زمانے کا ہے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد "خوش معاشی" کی حالت نہ رہی ہو۔ اور مرزا کے اپنے خط کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا کی ننھیال کی غیر معمولی خوش حالی اور فارغ البالی کب تک برقرار رہی۔ اور مرزا کے لیئے وہاں کوئی الجھنیں تو نہ پڑ گئیں۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ مرزا کے ابتدائی ایام اور ننھیال کے متعلق کئی ایسے سربستہ معمے ہیں جنہیں یہ مان کر کہ مرزا کی طفولیت اور عنفوان شباب تمام تر خوشی اور عیش و مسرت کا گہوارہ تھا۔ ہم کسی طرح حل نہیں کر سکتے۔ اور تمام حالات اور واقعات کا جائزہ لینے سے خیال ہوتا ہے کہ اگر مرزا کے ابتدائی ایام میں خوشی و بے فکری اور عیش و مسرت کا حصہ تھا۔ تو ایسے اثرات بھی تھے۔ جو ناگوار خاطر تھے۔ اور جن سے مرزا کو اپنی کوتاہیوں اور اپنے گرد و پیش کے مقابلہ میں اپنی کہتری کا احساس ہوتا تھا۔

مرزا کا آگرے میں قیام ایک پھولوں کی سیج پر تھا۔ لیکن ان پھولوں میں کانٹے بھی تھے جو چبھتے تھے۔ اور جن کی خلش دیر تک قائم رہتی۔

مرزا ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ وہ جب زندہ تھے تب بھی "پراگندہ روزی پراگندہ دل" رہتے تھے۔ اپنے بھائی نصر اللہ خاں کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نہ کوئی ریاست نہ جاہ و ثروت! کیا مرزا کے حساس دل پر ان حالات اور واقعات کا اثر نہ ہوتا ہوگا؟ وہ جب اپنے گرد و پیش بڑی بڑی

حویلیاں، اور اپنے قرابت داروں میں بڑے بڑے رئیس دیکھتے ہوں گے اور اپنے ہمجولیوں سے پوچھتے ہوں گے کہ میرا باپ کون تھا؟ کیا تھا؟ تو کیا اس کا جواب انہیں پست خاطر ہوتا ہوگا۔ اور کیا وہ دل ہی دل میں اپنے ماحول کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور ضعیف بنیادی محسوس نہ کرتے ہوں گے؟

آگرے میں مرزا کا قیام اپنی ننھیال میں تھا۔ ان کی ننھیال خوشحال تھی۔ اور اپنے نانا اور نانی کو وہ بیحد عزیز ہونگے لیکن قدیم گھرانوں میں بھی اس بیٹی کی زندگی، جس کا شوہر خانہ داماد ہو اور تلاشِ معیشت میں کامیاب نہ ہو، قابلِ رشک نہیں ہوتی۔ والدین تو اپنی بیٹی اور اس کی اولاد کو سینے سے لگا کے رکھتے ہیں۔ لیکن کئی دوسرے ایسے ہوتے ہیں جن کے تعلقات اتنے قریبی نہیں ہوتے۔ اور جو اس صورت حالات کی تلخی فریقین پر روشن کرتے رہتے ہیں۔

مرزا کے نانا کے متعلق معلوم نہیں۔ کہ وہ کب تک زندہ رہے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں کہ مرزا کے کتنے ماموں تھے۔ اور ان کے نانا کی وفات کے بعد ان کے ماموؤں اور ممانیوں کا ان کے ساتھ کیا سلوک رہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک معمہ ہے کہ اگر مرزا کی ننھیال اس قدر خوشحال تھی۔ اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ تو انہیں آگرہ چھوڑنے اور نواب احمد بخش یا کسی پھوپی کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے۔ کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں۔ تو ماں انہیں آگرے سے کبھی کبھار کچھ بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت مصیبتیں آئیں۔ ان کا بھائی دیوانہ ہو گیا۔ قرضخواہوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی۔ قماربازی کی وجہ سے انہیں جیل جانا پڑا۔ غرضیکہ ان کے ہر

مصیبتوں اور رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ لیکن اُن کے خطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں۔ کہ ان کی ننھیال میں سے کسی۔ نے آکر ان کی خبر بھی پوچھی ہو۔ ان کے خطوط میں سے کوئی خط کسی ماموں، یا ماموں زاد بھائی یا کسی ایسے قریبی کے نام جس کا تعلق ان کی ننھیال سے ہو موجود نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان قرابت داروں کا ذکر بھی خطوط میں اتنا تھوڑا ہے۔ کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک ادھ خط میں مرزا اورنگ خاں کا ذکر کرتے ہیں جس نے مرزا کو اس زمانے میں باندا بلایا تھا۔ جب وہ دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ باقر بلگرامی کے نام کے خطوط میں مرزا عباس اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا ذکر ہے جو مرزا کے بھانجے تھے۔ لیکن یہ ذکر بھی اس طرح ہے کہ مرزا عباس کی طرف سے کسی چاہ اور محبت کا نشان نہیں ملتا۔

کیا اس تمام صورت حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا ہوگا۔ کہ مرزا کے لئے ننھیال میں فقط خوشی اور بے فکری نہ تھی۔ کلفتیں اور باطنی کش مکش بھی تھی؟ اور پتہ نہیں۔ کہ مرزا کی ننھیال کی اپنی حالت کمزور ہو گئی۔ یا مرزا سے وہ کسی وجہ سے دل سرد ہو گئے لیکن اتنا نظر آتا ہے کہ جو عیش و آرام انہیں ابتداء میں میسر تھا اور جو پاس خاطر ان کا شروع میں ہوتا تھا۔ وہ اخیر تک برقرار نہ رہا۔

مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوئی۔ اور اس نے انہیں دہلی کے ایک ممتاز ترین گھرانے سے وابستہ کر دیا۔ لیکن مرزا الٰہی بخش کی حیثیت اپنے بھائی نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو فیروز پور جھرکہ کے مقابلے میں ایک طفیلی کی تھی۔ اور جیسا کہ آزاد نے آبِ حیات میں بتایا ہے۔ نواب احمد بخش بھی کبھی کبھی اپنے اخراجات کی زیادتی جتا دیتے تھے۔ مرزا کو اس ماحول میں بھی اپنی پستی کا احساس

ہوتا ہوگا۔ جوان کے اُس احساسِ کمتری کے لئے جو ظاہری وضعداری اور عیش وعشرت کے باوجود ان کے دماغ کی عمیق گہرائیوں میں پرورش پا رہا تھا، تازیانے کا کام دیتا ہوگا۔

نفسیات کے عالم کہتے ہیں کہ ایک انسان کی شخصیت اور ذہنی نشوونما کی بنیادیں مستحکم طور پر پہلے پانچ سات سال میں رکھی جاتی ہیں۔ اس مدت میں اگر کسی بچے کے ضمیر میں احساسِ کہتری (Inferiority complex) گہری جگہ پالے۔ تو وہ غیر شعوری طور پر اس احساس کا ازالہ کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ احساس حد سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کا ذہنی توازن جاتا رہتا ہے۔ ان کا تحت الشعور تو اس کی تلافی، ان بچاروں کے خیالات کو اس احساس کے متقابل دوسری انتہا پر لے جا کر کرتا ہے۔ اور وہ اپنے وہم کے فریب میں آ کر اپنے آپ کو بادشاہ نبی یا اسی طرح کی کوئی اور فوق العادت ہستی سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے انسان بالعموم عقل و ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ذہنی بے قاعدگی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس قدر خطرناک نہیں۔ اس ذہنی بے قاعدگی کی ایک مثال تو ان لوگوں میں دیکھی جا سکتی ہے جو طبعاً ڈرپوک ہوتے ہیں اور اپنی باطنی کمزوری کا ازالہ بڑے بڑے جھوٹے دعوے باندھ کر یا لوگوں کو ڈرا دھمکا کر کرتے ہیں۔ احساسِ کہتری کے یہ مظاہر جن میں اپنی باطنی کمزوریوں کی تلافی عملی اور ٹھوس محنت سے نہیں۔ بلکہ وہم و پندار کو زور دے کر، یا لفاظی اور ریاکاری کو بڑھا کر کی جاتی ہے مضحکہ خیز بلکہ افسوسناک ہوتے۔ لیکن اگر احساس کہتری مناسب حدود میں رہے۔ اور انسان اس کی کمی، اپنی اصلاح کر کے یا اپنی دوسری قوتوں کو ترقی دیکر اور انہیں معراجِ کمال پر پہونچا کر پوری کرے۔ تو نتائج بڑے خوشگوار رہتے ہیں

خوش قسمتی سے انسانی تاریخ میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ماہر نفسیات کا ایک مشہور عالم ایڈلر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے فوق العادت ترقی کی ہے۔ ان کے دل میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کا احساسِ کہتری ہوتا ہے جو ان کے توسنِ ہمت کے لیئے تازیانے کا کام دیتا ہے اور جس کی بدولت وہ اس طرح کی کوشش اور محنت گوارا کر لیتے ہیں جس سے عام لوگ دل چُراتے ہیں۔ تیمور کی نسبت معلوم ہے۔ کہ وہ ایک پاؤں سے لنگڑا تھا۔ طبعاً وہ بلند ہمت اور اولوالعزم تھا۔ لیکن ایک عضو کی کمزوری سے جو احساسِ کہتری اس کے دل میں تھا اس کی تلافی اس نے اپنا زور و اقتدار بڑھا کر اور ایک مشہورِ عالم فاتح بن کر کی۔ اسی طرح نپولین کا قصہ ہے۔ جو قد میں اپنے ساتھیوں سے بہت چھوٹا تھا اور جسے اس کے ہم جماعت مذاق و حقارت سے بونا کارسیکی (Little Corsican) کہا کرتے تھے۔ اس نے اپنے احساس کہتری کا جس طرح ازالہ کیا۔ اس کی داستان صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو مرزا کی ذہنی نشو و نما اور حالاتِ زندگی میں بھی اسی نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شاندار ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انہیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ انھوں نے مادی ترقیوں کے لیئے فضا کو ناسازگار سمجھ کر اُدھر سے آنکھیں بند کیں۔ بزرگوں نے جو میراث چھوڑی تھی۔ اس پر قناعت کی۔ اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیئے شعر و سخن کا راستہ چُنا۔ تاکہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل ہو جائے۔ کہ اپنے ہم چشموں میں کسی سے کمتر نہ رہیں۔

غالب کا ادبی مطمحِ نظر

مرزا غالب ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :-

"آہ از من کہ مرا زیان زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بآئینِ نیاگان خویش سلطان سنجر دارائے کلاہ و کرے، نہ بفرہنگ فرزانگان پیش بوعلی آسا علم و ہنرے گفتم درویشی باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بود دم راہبری کرد۔ و مرا بداں فریفت۔ کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است۔ سرلشکری ما نشد منشی ملہ خود نیست۔ صوفی گری بگزار۔ و سخن گستری رُوئے آر۔ ناگزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحرِ شعر ...... رواں کردم۔ قلم علم شد۔ و تیر ہائے شکستہ آبا قلم۔

مرزا غالب کا مقصدِ حیات متعین کرنے کا نفسیاتی عمل تو وہ تھا جسے ہم شاعر کے الفاظ میں بیان کر چکے۔ لیکن اس تعین و انتخاب میں ان کے عام ماحول اور شخصی حالات کو بھی بڑا دخل تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات کشور کشائی اور "کلاہ و کمر" کے لیے سازگار ہوتے۔ تو مرزا بھی اپنے بزرگوں کی طرح ان چیزوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے۔ لیکن اب زمانہ اس کا نہ تھا۔ جب مرزا پیدا ہوئے۔ تو سلطنتِ مغلیہ کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ آٹھ سال کے تھے کہ لارڈ لیک نے دہلی اور آگرہ فتح کیا۔ اور شمالی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مستحکم حکومت قائم کر کے ان افغان اور مغل قسمت آزماؤں کی قابلِ حصول آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جن سے بے قرار ہو کر انھوں نے اطرافِ ملک میں حکومتیں قائم کی تھیں۔ یا دوسری طرح اپنے آپ کو سربلند کیا تھا۔ اب اس کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور ہوتی بھی تو مرزا کے خاندانی حالات ناسازگار تھے۔ مرزا نے دیکھا کہ اب دنیوی قدر و منزلت کی معراج تو میسر نہیں آسکتی۔ انھوں نے کوشش کی باگ

اس راستے پر پھیری۔ جو اس سیاسی زوال اور کمپنی کے تسلط میں بھی بند نہ ہوا تھا۔ اور اپنے آبا کی زمینی فتوحات کی جگہ معنوی اور فنی کامیابیوں کو مقصدِ حیات بنایا ؎

چوں رفت سپہدی، زدم چنگ بہ شعر
شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلم

اور

شاہد و مے زمیاں رفتہ و شادم بہ سخن
کشتہ ام بیدراں باغ کہ ویراں شدہ است

مرزا غالب نے اپنے مقصدِ حیات کی جو توضیح کی ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے۔ کہ یہ سپاہی زادہ بوعلی کی علمی فتوحات کی بھی اسی طرح قدر کرتا تھا۔ جس طرح سلطانِ سنجر کی کشور کشائی کی۔ بنیادی طور پر تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طائرِ بحر درح کو ایک آشیانۂ بلند کی تلاش تھی، خواہ وہ کسی وادی میں ہو۔ لیکن علم و ہنر کی کشش میں مرزا کی خداداد حکیمانہ طبیعت کو بھی دخل ہوگا۔ جس کی پرورش گلاب محل آگرہ کے علمی ماحول اور مرزا ہرمزد کی صحبت میں ہوئی تھی ۔

مرزا نے شعر و سخن کی جو خاص منزل منتخب کی۔ اس میں بھی اس حکیمانہ مذاق کو دخل تھا۔ شاعری مرزا کے لیئے محض موزونیٔ طبع کا اظہار نہ تھی۔ بلکہ مقصود بالذّات بھی نہ تھی شاعری سے مرزا کا جو مقصد تھا وہ انھوں نے سطور بالا میں بیان کر دیا۔ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن ۔ وہ اپنے آپ کو "آئینۂ راز" کہتے تھے "محرمِ رازِ نہانِ روزگار" "رازدانِ خوئے دہر" انھیں احساس تھا کہ رازہائے ہستی ان کے سامنے بے نقاب ہیں۔ اور ان کی شاعری کا مقصد قانونِ راز کی نواسنجی ہے ؎

خوشت باد غالب بہ ساز آمدن
نوا سنجِ قانونِ راز آمدن

مرزا غالب کے ادبی مطمحِ نظر کی عمومی افادیت ظاہر ہے۔ لیکن اس سے شاعر کو بھی فائدہ پہونچا۔ ان بلند مقاصد نے مرزا کے فنی عزائم کو سربلندی دی۔ انہیں خود اعتمادی اور وقار دیا۔ جو لکد کوبِ حوادث کے مقابل میں ایک ڈھال بنا۔ وہ جس مقام پر تھے وہاں کم فہم نکتہ چینیوں کے تیر و تفنگ بے اثر تھے ؎

چہ ازیں فرقۂ اداشناس   خویشتن را ہلاکِ پاس کنم

وہ دوسرے شاعروں کو کس طرح خاطر میں لاتے جن کی معراج تمنا عام فہم او عام پسند خیالات کو گوارہ صورت میں نظم کرنا تھا۔ ان کی دنیا ہی دوسری تھی ؎

در ترقی می نگنجد گفتگو   در تنزل دم زعرفاں می زنم

شروع شروع میں مرزا نے شعر و سخن میں امتیاز اور ناموری حاصل کرنے کیلئے سہل الحصول لیکن مضر اور کم مایہ طریقہ اختیار کیا۔ اور یہ خیال کیا۔ کہ طرزِ بیان میں جدت بلکہ غرابت حاصل کرنے سے میں شعراء میں بے نظیر ہو جاؤں گا۔ مرزا کے ابتدائی اشعار ایک حد تک "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" کے مصداق ہیں۔ لیکن وہ ازل سے اصلاح پذیر طبیعت اور مضبوط ہوش و خرد لائے تھے۔ انھوں نے چند سالوں میں ہی سمجھ لیا۔ کہ یہ راستہ بحرِ معانی کی طرف نہیں بلکہ ایک سراب بے آب کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے طبیعت کی باگ پُرمغز لیکن عام فہم طرزِ شاعری کی طرف موڑی۔ جس میں امتیاز دیر سے اور محنت اور سخت جانفشانی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس میں فروغِ حقیقی امتیاز اور دائمی شہرت کا پیش خیمہ ہوا۔

شباب

شاہجہاں آباد

جب مرزا غالب دلی آئے تو اس شہر کا نام شاہجہاں آباد تھا۔ لیکن اب اس کا ناک نقشہ وہ نہ تھا جو شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانے میں تھا۔ عہدِ عالمگیری میں دلی کی آبادی میں لاکھ کے قریب تھی۔ حملۂ نادری کے بعد یہ تعداد گھٹ کر پانچ لاکھ رہ گئی۔ اور جب مرزا پہلے پہل یہاں آئے۔ تو آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔

جو زوال بلکہ انقلاب دارالخلافہ کی آبادی اور رونق میں ہوا تھا۔ وہی حکومت کی سطوت و قوت میں رونما تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کی روایتی "جنگ برادران" عالمگیر کے چاہیتے اراکین حکومت یعنی اسد خاں، وزیر اعظم اور اس کے بیٹے ذوالفقار خاں سپہ سالار کی بے تدبیری، امراء کی خانہ جنگی، ایرانی اور تورانی اختلافات، جہاندار شاہ جیسے نالائق اور عیش پرست بادشاہوں کی تخت نشینی، سید برادران کی فرض ناشناسی بلکہ ذاتی اغراض و عناد کی خاطر سلطنت سے نمک حرامی، نادری اور احمد شاہی حملوں، جاٹوں کی لوٹ، مرہٹہ گردی اور غلام قادر روہیلہ کی احمقانہ سفاکی نے حکومتِ دہلی کو جسدِ بیجان بنا دیا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے صوبے خود مختار تھے۔ خزانہ خالی تھا تنخواہ نہ پانے کی وجہ سے فوج منتشر ہوگئی تھی۔ بادشاہ ۱۸۰۳ء تک کبھی مطلق مادھوجی سندھیا کے زیر نگین تھا اور اس کے بعد قلعہ سے باہر اصل حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔

سیاسی طور پر یہ زمانہ دہلی کے انتہائی زوال کا تھا۔ لیکن اب اس کمزور و ناتواں بلکہ نیم بیجان جسم میں زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس میں زیادہ تر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کو دخل تھا۔ جنہوں نے لٹے ہوئے دارالخلافہ کو مسلمانانِ ہند کے علومِ دینی کا مرکز

چنانچہ سوسائٹی کا نظام زیادہ سادگی کے ساتھ (اور ایک حد تک بلاقی بل وغیرہ کے قرضوں کی مدد سے) کسی حد تک استوار ہوتا جاتا تھا۔ ادبی اور تہذیبی کاموں کا بھی تھوڑا بہت خیال ہو رہا تھا۔ بعض انگریز حکام کو فارسی ادب اور مغل طرزِ معاشرت سے اُنس تھا۔ اس زمانے میں انگریزی کی تعلیم ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ اس لئے انگریز حکام کو فارسی اور دیسی زبانیں جانے بغیر چارہ نہ تھا۔ بعضوں نے ان میں خاصی مہارت پیدا کرلی تھی۔ بلکہ انیسویں صدی میں اردو کے انگریز شعرا کے بھی نام ملتے ہیں۔ معاشرتی طور پر ابھی انگریزوں اور ہندوستانیوں میں وہ خلیج پیدا نہ ہوئی تھی جو وکٹورین نظامِ اخلاق۔ امپیریلزم کے ایک فلسفہ اور غدر نے پیدا کردی۔ اس کے زمانہ کے کئی انگریز حکام کا رہن سہن مغل طرزِ معاشرت کی نقل تھا۔ کتنوں نے یہاں شادیاں کرلیں۔ معزز مقامی خاندانوں سے دوستانہ ارتباط تو اکثر کا تھا مثلاً دلی کا پہلا ریذیڈنٹ اختر لونی سرسید کے نانا فرید الدولہ کے ہاں اس طرح اور اس کثرت سے آتا جاتا کہ گویا وہ ان کے خاندان کا ایک فرد تھا۔ یہی حال ولیم فریزر کا نواب احمد بخش کے خاندان سے تھا۔ اس معاشرتی راہ و رسم نے نئے تعلقات کی تلخی محسوس نہ ہونے دی۔ بلکہ انگریز حکام کو موقع دیا۔ کہ وہ شہری زندگی کی شیرازہ بندی میں ہاتھ بٹائیں ادبی اور تہذیبی کاموں کا بھی تھوڑا بہت خیال ہونے لگا اور کچھ عرصہ بعد دلی کالج قائم ہوا۔ جو غدر سے پہلے شمالی ہندوستان میں جدید علم و فن کا ایک کارآمد مرکز تھا۔

قلعہ معلّی

قلعہ معلّی سے بھی تغیر و تبدل کے تعمیری عمل کو تقویت پہونچ رہی تھی۔ مغل بادشاہ اب خود مختار نہ سہی۔ لیکن انھوں نے اپنا وقار برقرار

بنا دیا اور قوم کی آئندہ تنظیم کی محکم بنیادیں رکھ دیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی باہمت ہستیاں تھیں، مثلاً خاندان میر درد، دوسرے متعدد نقشبندی بزرگ مثلاً مرزا مظہر جانجاناں، شاہ غلام علی قدس سرہ۔ کئی مغل خاندان جنہیں نادری حملہ اور جاٹوں، مرہٹوں کی یلغاریں اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔ انھوں نے علم و ادب کی شمعیں بجھنے نہ دیں۔ جو طوفان کا زور کم ہونے کے بعد زیادہ روشن ہو رہی تھیں۔

مرہٹوں کے جانے اور انگریزوں کے آنے سے شہر کے علم و ادب پر خوشگوار اثر پڑا۔ اس سے پہلے شہر اور شہر کا قرب و جوار (مرہٹہ اور دوسرے حملہ آور نہ سہی) ڈاکوؤں اور لٹیروں سے محفوظ نہ تھا۔ اور جہاں جان و مال خطرے میں ہو۔ وہاں علم و فن کا عروج پانا محال ہے۔ چنانچہ دلی میں جو کوئی شعر و سخن یا اور فن میں نام پاتا۔ اسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لے جاتی۔ لیکن انگریزی نظم و نسق نے شہر اور شہر کے گرد و نواح میں امن قائم کر دیا۔ اور شہری اور علمی زندگی کا شیرازہ بندھنے لگا۔

نئی حکومت کا مسقط الراس کلکتہ تھا۔ لیکن ابر کرم کے چند چھینٹے اس طرف پڑ جاتے جو اس جھلسی ہوئی لیکن زرخیز مٹی کے لیے کافی تھے۔ قدیم نظام عدالت، نظام تعلیم، بلکہ عام نظم و نسق میں ابھی بہت تبدیلیاں نہیں ہوئی تھیں۔ فارسی کا سکہ ۱۸۳۷ء تک سرکاری عدالتوں میں چلتا رہا۔ صدر اور صدر الصدور ابھی تک برقرار تھے۔ عام نظم و نسق کا وراثتی بلکہ مسلمانوں میں تھا۔ لارڈ ڈلہوزی سے پہلے حکومت کی پالیسی بھی یہی تھی کہ تبدیلیاں دھیمی دھیمے اور آہستہ ہوں۔ اس صورت حال سے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ نئی حکومت کے عہدہ داروں میں کئی ممتاز مسلمان تھے۔ مثلاً مفتی صدرالدین صدر الصدور۔ مولوی فضل حق سر رشتہ دار، سید احمد خاں منصف، معاصرانہ کشمکش میں بعض مسلمانوں نے نئی

رکھا تھا۔ جسے نہ مرہٹوں نے، نہ ابتدائی انگریز عہدہ داروں نے ٹھیس لگنے دی۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۰۳ء میں فتح دہلی کے وقت لارڈ لیک کی شاہ عالم سے جو خط و کتابت ہوئی تھی، اور بادشاہ کے حقوق کے متعلق جو وعدے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق دو رویہ طرز عمل اختلاف اور کاغذی کش مکش کا سلسلہ شروع سے جاری تھا۔ اور جوں جوں اس ملک میں برطانوی نظام حکومت مستحکم ہوتا گیا۔ لارڈ لیک کی تحریروں کے اندراجات بھی ساتھ ساتھ محو ہوتے گئے۔ لیکن ولیم ہاکنس، ایکٹنگ ریذیڈنٹ (۱۸۳۰ء) کے زمانے تک بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور جب ہاکنس نے یہ دستور بدلنا چاہا تو اسے ریذیڈنٹی سے ہٹا دیا گیا۔ فی الواقع مرہٹوں کے زمانے میں ایک عجیب طرز کا اسلوب کار شروع ہوا تھا۔ جو شیواجی کے جانشین راجہ ستارہ اور اس کے با اختیار مدار المہام پیشوا کے تعلقات کے مشابہ تھا اور Constitutional monarchy سے بہت دور نہیں تھا یعنی اصل اختیار تو وکیل مطلق کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن ظاہری رکھ رکھاؤ بادشاہ کا برقرار تھا۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی کی اور بتدریج "برائے نام بادشاہی" کو نیشن خوداری میں بدلنا چاہا۔ لیکن بہت مدت تک ظاہری مراسم و آئین میں کوئی فرق نہ آیا۔ قلعہ کے اندر بادشاہ کو پورے شاہانہ اختیارات حاصل تھے۔ بازار قلعہ میں جو لوگ رہتے وہ صحیح معنوں میں اس کی رعایا تھے۔ شاہی خاندان کے اراکین اور سب کار سلاطین کا وہ ہجوم جو شاہی خاندان سے کسی طرح متعلق تھے، برطانوی عدالتوں اور نظم و نسق کی دستبرد سے باہر تھے۔ دربار کا سلسلہ پرانی وضع پر تھا۔ وہی خطابات، وہی رسوم، وہی آئین۔ ریذیڈنٹ دربار میں باقاعدہ، قدیم وضع سے حاضری دیتا۔ دوسروں کی طرح نقار خانہ کے سامنے پاپیادہ ہو جاتا۔ حضور شاہی میں پہنچ کر دوسروں کی طرح نذر دیتا۔ اور باادب طریقے

سے کھڑا رہتا۔ ۱۸۱۳ء تک گورنر جنرل کی طرف سے بھی باقاعدہ نذر پیش ہوتی رہی۔ شہر میں بادشاہ کی سواری کا جلوس تزک و احتشام سے نکلتا۔ بادشاہ کو اپنے ملازمین کو خطابات دینے کا حق تھا[1]۔ سکوں پر ۱۸۳۵ء تک مغل بادشاہ کا نام رہا۔ اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی سندِ وراثت پر مغل بادشاہ کی مہرِ توثیق کو اب بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی اور اکبر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔ ان کے زمانے میں شاہی حقوق کے مسئلہ نے لب اوقات نازک صورت اختیار کرلی۔

مثلاً ۱۸۱۳ء میں لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل نے بادشاہ کو گورنر جنرل کی طرف سے مختلف موقعوں پر باقاعدہ نذر پیش کرنے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اور ۱۸۱۴ء میں جب وہ دلی آیا تو بادشاہ سے اس کی ملاقات اس لیئے نہ ہو سکی کہ بادشاہ نے اسے بوقت ملاقات اپنے برابر کرسی دینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح کی کش مکش بادشاہ اور حکام انگریزی میں جاری رہی اور نئے حکمرانوں نے اپنی طاقت مستحکم ہونے کے بعد بادشاہ کے بعض دعاوی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن ظاہری مراسم اب بھی بہت حد تک برقرار رہے۔ قلعہ میں کوئی مداخلت نہ ہوتی۔ اور شہر میں شاہی جلوس اور سواری کا اہتمام اسی شان سے ہوتا جس طرح پہلے تھا۔

بادشاہ کے ذمہ لاتعداد بیکار و بے روزگار سلاطین کا خرچ تھا۔ اور قلعہ کی ظاہری

---

[1] شاہ عالم نے لارڈ لیک کو "صمصام الدولہ" ہژبر الملک" خان دوراں" فتح جنگ" کا خطاب دیا تھا۔ لیکن ۱۸۲۸ء کے بعد بادشاہ کے ذاتی ملازمین کے علاوہ دوسروں کے لیئے ان خطابات کو تسلیم کرنے سے کمپنی نے انکار کر دیا۔

حالت برقرار رکھنے کے لیے بھی ایک بڑی رقم درکار تھی۔ انگریزی حکام سے بادشاہ کا ایک بڑا اختلاف اخراجات کے متعلق تھا۔ لیکن بہرکیف بادشاہ کی مالی حالت اس زمانے سے بہتر تھی۔ جب مرہٹوں کے زمانۂ اقتدار میں بے امنی کی وجہ سے شاہی خاصہ کی زمینوں سے بہت کچھ وصول نہ ہوتا تھا۔

آہستہ آہستہ بادشاہوں نے دلچسپی کے نئے سامان ڈھونڈھ لیے۔ شاہ عالم نے وسیع پیمانے پر شغل شاعری اختیار کیا۔ اس کے جانشینوں نے اسے برقرار رکھا اور ان کی ادبی دلچسپیوں اور شاعر نوازیوں سے ابوظفر بہادر شاہ کے زمانہ میں مغلیہ دربار ایک اہم ادبی مرکز بن گیا۔ مختلف شاہزادوں نے بھی اس میں ہاتھ بٹایا۔ اور قلعہ شاہی کے اندر جو مشاعرے ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف داغ کے مذاقِ شعر کی پرورش کی۔ بلکہ دیوانِ غالب میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ دربار شاہی میں حتی الوسع قدیم روایات کی پاسداری ہوتی تھی۔ لیکن آخری مغل بادشاہوں نے اس زبان کی سرپرستی کی۔ جو فارسی کی جگہ لینے والی تھی۔ اور یہ قلعہ دہلی کا اثر تھا کہ غالب کو فارسی چھوڑ کر پھر سے اردو میں شعر گوئی شروع کرنی پڑی۔

قلعہ دہلی کا ادبی فیض شاعر پروری تک محدود نہ تھا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانے میں شاہی کتب خانہ تک منتخب اور مستحق اہلِ علم کی رسائی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کی نسبت اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے۔ کہ وہ بوقتِ ضرورت شاہی کتب خانہ سے کتابیں منگاتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ نسبتاً وسیع تھا۔ مثلاً حافظ نذیر حسین محدث ان دنوں ایک معمولی طالب علم تھے۔ ان کی سوانحعمری حیات بعد المماۃ میں لکھا ہے "کہ وہ قلعہ میں رہ کر بھی کتابیں پڑھتے تھے۔ اور کتب خانہ سے گھر پر بھی کتابیں لیجا کر مطالعہ کرتے تھے فی الواقع

قلعہ کا کتب خانہ اب ایک پبلک نیشنل لائبریری کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔

شاعر نوازی اور اہل علم کی سرپرستی کے علاوہ آخری بادشاہوں نے روحانی امور میں بھی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اکبر شاہ ثانی نے پیری مُریدی کا سلسلہ شروع کیا اور بہادر شاہ نے اُسے بڑی وسعت دی۔

دہلی کی علمی چہل پہل

نئے امن و امان، خاندان ولی اللہی کے فیض شاہان دہلی اور دوسرے قدیمی خاندانوں کی ہُنر پروری، اور جدید ترقی پسندانہ اثرات نے دہلی میں ایک علمی چہل پہل پیدا کر دی تھی۔ اور انیسویں صدی کے شروع میں بقول حالیؔ "دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے باکمال جمع ہو گئے۔ جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے۔" سر سید احمد نے آثار الصنادید میں اس زمانے کے اکابر علماء اور شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانے کے شعراء میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، مومنؔ علماء میں شاہ عبدالعزیزؒ۔ شاہ اسمٰعیلؒ۔ حضرت سید احمد بریلویؒ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ اطباء میں حکیم محمود خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں حکیم رضا خاں اور نقادوں میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ موجود تھے (اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے زیر اثر سر سید۔ حالیؔ۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ اور داغؔ کی تربیت ہوئی جنہوں نے خود پرانے نظام کے پروردہ ہونے کے باوجود بیس سال کے عرصے میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظامِ تعلیم نیا لٹریچر اور مذہب کی مدافعت کے لئے نئے ہتھیار دے دیئے) تو ہمیں غالبؔ کے اس شاندار ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا وہ خود ایک جزو تھا۔ اور جس کی ناواقفیت سے عوام کی نظروں میں غالبؔ کی شخصیت ایک معمہ بن گئی ہے۔

مولانا حالی اُس زمانے میں دہلی آئے۔ جب یہاں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اس زمانے کی ایک دلنشین تصویر کھینچی ہے

اے جہاں آباد، اے اسلام کے دار العلوم ‏‏‏‏ اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم ‏‏‏‏ تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم دیں ‏‏‏‏ جیسے اُمّی تجھ میں تھے، عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں تھا جو محدّث، تھا وہ تیرا خوشہ چیں ‏‏‏‏ تھی محدّث خیز اے پاتخت تیری سرزمیں
تھا تفقہ بھی مُسلّم تیری خاکِ پاک کا
بیہقیِ وقت تھا اک اک فقیہہ اس خاک کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم ‏‏‏‏ آن کر اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم ‏‏‏‏ بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم ‏‏‏‏ جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم ‏‏‏‏ کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے اُٹھ کے جھوم جھوم
آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

دَورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا ۔ بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تُو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں پھر تری اُگلے وہ لعلِ بے بہا جن سے روشن ہو گیا، کچھ دن کو نام اسلاف کا
عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا
جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دَورِ اکبری
علم و دین و شعر و حکمت ۔ طب و تاریخ و نجوم
ڈالدی پھر تو نے اپنی چارسُو ہر فن میں دھوم

جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ ریفارمیشن (Reformation) یعنی اصلاحِ مذہب) اور رینائیسنس (Renaissance) یعنی نشاۃ ثانی) کی دو تحریکوں سے واقف ہونگے ۔ جنہوں نے سولھویں صدی میں وہاں نئی روح پھونک دی تھی ۔ اور علمی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا ۔ مرزا جس وقت دہلی آئے ۔ یہاں بھی اسی قسم کے حالات کا آغاز تھا ۔ جنہوں نے دو صدیاں پہلے یورپ کی کایا پلٹ دی تھی ۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی ۔ اور اس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہوا ۔ دہلی میں چھاپے کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا ۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعتِ علم کو وہی فائدہ پہونچ رہا تھا ۔ جو یورپ میں ہوا ۔ "رینائیسنس" کا ایک اہم واقعہ بائبل کا انگریزی ترجمہ ہے ۔ جس کی ابتدا میں بیحد مخالفت ہوئی ۔ اور جس کی وجہ سے وکلف اور اس کے ساتھیوں کو سخت ایذائیں پہنچائی

گئیں۔ ہندوستان میں بھی قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کرنے پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ننگی تلوار کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان کی جرأت اور قابلیت سے ۱۷۳۷ء ہی میں ہندوستان میں وہ مرحلہ طے ہو گیا جس کے لیے ترکی کو دو صدیاں اور انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی ریناسینس کی ایک اہم خصوصیت عام ملکی زبانوں کی ابتدا تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی کی جگہ اُردو لے رہی تھی۔ اور چونکہ یہ بزرگ زمانہ کی رفتار پہچانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے نئی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اُردو نثر کی بہت ابتدائی کتابوں میں قرآن مجید کا اُردو ترجمہ تھا۔ جسے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی میں مرتب کیا۔

علاوہ ازیں جس طرح مغربی ریناسینس کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت درس و تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلموں اور مدرسوں کی وجہ سے شہرہ آفاق تھی۔ بالخصوص شاہ عبدالعزیزؒ کی ذاتِ والاصفات کی موجودگی سے جو اپنی سلامت روی، صحیح قوتِ فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی ریناسینس کی ایک قابلِ احترام ہستی ایرازمس (Erasmus) سے مشابہ ہیں۔ اور جن کے درس کے لیے کشمیر، افغانستان اور بلخ و بخارا سے طلباء کھنچے آتے تھے۔ ان کے علمی تبحر اور انصاف پسندی کے آگے سب سر جھکاتے تھے۔ اور نہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب سرکارِ انگریزی نے دہلی کالج قائم کیا اور لوگ وہاں اولاد بھیجنے کے متعلق متامل تھے۔ تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے وہاں تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی۔ اور علیگڑھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور سرکاری درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے

حق میں فتویٰ دیا۔[1]

جنرل سلیمن جو ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا۔ اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں:

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے۔ وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔ اور جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں سیکھتے ہیں۔ وہی یہ لوگ فارسی اور عربی زبانوں میں سیکھتے ہیں۔ اور سات سال کے درس کے بعد ایک طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے۔ دستارِ فضیلت باندھتا ہے۔ اور اسی طرح روانی سے سقراط۔ ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط جالینوس اور بوعلی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب علم

جنرل سلیمن نے ایک اور جگہ لکھا ہے:

"ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ۔ ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور

---

[1] اسبابِ غدر مصنفہ سر سید

موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہیں سمجھنے کا بہت شعا ہشمند ہوتا ہے!

ان سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظامِ تعلیم اُس زمانے کے انگریزی نظامِ تعلیم سے (یا آکسفورڈ یونیورسٹی کے موجودہ کلاسیکل کورس سے) کسی طرح پست نہ تھا۔ اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جن معلموں کے حلقۂ درس سے سرسید۔ حالی۔ آزاد۔ داغ۔ شیفتہ (اور غالب) دستارِ فضیلت باندھ کر نکلیں انہیں اپنے درس و تدریس پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔

تحریکِ اصلاح

اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیلؒ کی تحریکِ اصلاح تھی (جسے سرسید احمد نے لوتھر کی تحریک ریفارمیشن کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن غالب کا ماحول سمجھنے کے لیے اس کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں اہل الرائے یا اس تحریک کے طرف دار تھے۔ یا مخالف۔ شاہ نصیر دہلوی نے جن کی مضحکہ خیز خوش اعتقادی کی کئی مثالیں آزاد نے آبِ حیات میں درج کی ہیں۔ اس تحریک کے رہنماؤں کے خلاف نظمیں لکھیں۔ برخلاف اس کے مشہور شاعر مومن مولانا سید احمد بریلوی کے مُرید تھے۔ اور کلیاتِ مومن کے کئی اشعار مولانا کی تعریف میں ہیں غیر مقلدین کے سب سے نامور حامی شاہ اسمٰعیل شہید اور سرسید احمد خاں تھے۔ اور مقلدین کے پرجوش ترجمان مولوی فضلِ حق تھے۔ جو قدیم علم پرور خیر آبادی خاندان کے رُکن اور غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔

مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی دلچسپی لی۔ اور ایک زمانے میں مولوی فضلِ حق کے

ایما پر عقائد وہابیہ کے خلاف اور قدیم نقطۂ نظر کی تائید میں ایک فارسی مثنوی امتناع النظیر خیر النبئین لکھی۔ لیکن جیسا کہ حالی نے یادگار غالب میں بیان کیا ہے ان کا اپنا نقطۂ نظر شاہ شاہ اسمٰعیل سے ملتا تھا۔ اور شروع میں انھوں نے اپنی مثنوی میں اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اس مثنوی کے مطالب کافی اہم ہیں۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ ہم آہنگی ہے جو شاہ اسمٰعیل اور مرزا کے عام اسلوب خیال میں تھی۔ شاہ صاحب کے مذہبی عقائد خواہ کچھ ہی ہوں۔ لیکن ان کی تصانیف کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف جہاد تھا۔ بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قائل تھے۔ لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے تھے۔ وہ یا تو رسوم وعقائد کا وہ طومار تھا جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا۔ یا ائمہ اربعہ کی کورانہ تقلید۔ شاہ اسمٰعیل ان میں کسی کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ صاحب کی تصانیف پڑھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وہ رائے عامہ اور مسلمہ ہستیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر غالب پر نہ ہوا ہو[۱]۔ اور اس کی طبعی آزاد خیالی اور راسخ نہ ہو گئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں۔ لیکن جس طرح انھوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم و معاشرت میں تقلید کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود فنِ لغت اور شعر گوئی میں اُستادوں پر آنا ناً نکتہ چینی کی۔ اور جس طرح شاہ صاحب بڑے بڑے بزرگوں کے نام گِنا کر کہتے تھے کہ آخر وہ انسان تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے

---

[۱] مولانا شہیدؒ نے اس زمانے کی ایک اور عظیم المرتبہ شخصیت پر اثر ڈالا۔ حالی سر سیّد کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور انہیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔"

ہیں وہ سب صحیح نہیں۔ اور ہر بڑائی بکبر صراطِ مستقیم نہیں ہوتی۔

غالب کا حلقۂ احباب

مرزا کے اس زمانے کے احباب کے متعلق ہمیں پوری واقفیت نہیں لیکن ان کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروفؔ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جو شعر کے بڑے دلدادہ تھے اور جن کے اکثر شعرا سے مربیانہ تعلقات تھے۔ اس لیے یقین ہے کہ مرزا بھی دہلی کے سب بڑے بڑے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوتے ہوں گے۔ معروفؔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ اور زبان میں صفائی اور روزمرہ کے بڑے مدّاح تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مرزا کی شاعری پسند نہ ہوگی لیکن یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ان کی صحبت کے زیر اثر مرزا زبان کی صفائی کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے ہوں گے۔

مرزا الٰہی بخش معروفؔ اور ان کے بھائی فخر الدولہ نواب احمد بخش کے دیوانخانوں میں ہی غالبؔ کو دہلی کے ان امرا و عمائد سے ربط و ضبط کا موقع میسر آتا تھا جن کی روایات کے وہ خود ترجمان ہوئے۔ دارالخلافہ اس وقت خانِ اعظم اور ذوالفقار خاں جیسے سپہ سالاروں اور شیخ فریدؔ خان خاناں جیسے مخیّر امیروں سے خالی ہو گیا تھا۔ اور وہ نہر ہی خشک ہو چلی تھی جس سے ان سایہ دار فیض بخش تناور درختوں کی سیرابی ہوتی تھی۔ لیکن ابھی طبقۂ امرا کا نظام برقرار تھا۔ بلکہ جوں جوں حکومت میں زوال آیا۔ اور امرا کے ہاتھ سے فنونِ سپہ گری اور مہماتِ ملکی میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع جاتا رہا۔ ان کی طبیعتوں کا استقلال خالی خولی وضعداریوں اور بے ضرورت تکلفات و رسوم میں صرف ہونے لگا۔ اور طبقۂ امرا کے آئین و قواعد اور بھی استوار ہو گئے۔

خاندانِ لوہارو اور دارالخلافہ کے دوسرے سربرآوردہ گھرانوں کے مقابلے میں

مرزا غالب کی ذاتی امارت ایک "امر مشتبہ" یا "اختلافی مسئلہ" تھی۔ جب بعد میں اس کی مالی قدر و قیمت معین کرنے کا وقت آیا تو اس کی مالیت باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ نہ نکلی۔ لیکن مرزا اپنی بیوی کے میکے میں کسی کے سامنے سرخم ہونے دیتے۔ وہ کچھ تو خاندانی تعلقات کی بنا پر کچھ اپنی ذہانت، شاعری، علم و فضل اور فنِ ندیمی کے زور پر۔ اور کچھ اپنے امیرانہ طرزِ معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اپنا درجہ قائم رکھتے اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی۔

ان کے اس زمانے کے احباب کی نسبت جو منتشر اندراجات ملتے ہیں۔ ان سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا کا گزر دارالخلافہ میں سب سے اونچی سوسائٹی میں تھا اور ان کے یار احباب چیدہ امیرزادے یا دوسرے برگزیدہ اصحاب تھے۔ ان کے اس زمانے کے ایک دوست معروف کے صاحبزادے اور نواب احمد بخش کے حقیقی بھتیجے مرزا علی بخش تھے جو غالب کے ہم عمر اور دور رشتوں سے ان کے قریبی تھے۔ ان کے علاوہ مولوی فضل حق نواب امین الدین اور نواب حسام الدین حیدر خاں کے نام مرزا کی تصانیف میں آتے ہیں۔ جب مرزا تیس برس کی عمر میں دہلی سے کلکتہ گئے ہیں۔ تو انھوں نے ایک مثنوی میں تینوں کا نام لیکر بڑی محبت سے یاد کیا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہی ان کے خاص الخاص دوست[1] تھے ۵

---

[1] لیکن غالباً خطوں کا جواب اور کاروباری امور صرف رائے چھجمل دیتے تھے۔ انہیں ایک خط میں کلکتہ سے لکھتے ہیں۔ "بخدا ہرگاہ کہ تامل میرزد و سگالش کردہ میشود کہ آیا شفیق من از ارباب وطن کیست۔ بجز و تامل حضرت بخاطرے آیند۔ و بس"

زار باب وطن جو یم سہ تن را | کہ رنگ و رونق اندابیں ﻧﮧ چمن را
چہ خود را جلوہ سنج نازخواہم | ہم از حق فضلِ حق را باز خواہم
چو حرزِ بازوے ایماں نویسم | حسام الدین حیدر خاں نویسم
چو پیوند قبا ئے جاں طرازم | امین الدین احمد خاں طرازم

ان میں سے مولوی فضل حق غالب کے سب سے بڑے محب اور محسن تھے۔ انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں راہنمائی کی جو ان کا اصل دائرہ عمل تھا۔ اور رند منش غالب کو متانت و استقامت کا راستہ دکھایا۔ اور علم و فضل کی محبت میں آشنا کیا۔ بلکہ آگے چل کر ان کی مادی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔ اور مرزا کے تعلقات دربار رامپور سے وابستہ کرائے۔ جو غدر کے بعد مرزا کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھا۔

مولانا فضل حق خیر آبادی جو ایک مشہور فاضل، مولوی فضل امام خیر آبادی کے صاحبزادے اور ایک نامور عالم مولانا عبدالحق خیر آبادی رامپوری کے والد تھے۔ قدیم طرز کے معقول علماء میں خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اور مرزا غالب کے ہم عمر تھے لیکن بلا کے ذہین اور قابل تھے۔ اس لیے چھوٹی عمر میں ہی بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ تذکرہ غوثیہ میں ان کی نسبت ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کے علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے:

ایک روز کا ذکر ہے کہ مولوی فضل حق نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امراء القیس کے قصیدہ پر کہا۔ اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں لائے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں

انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیئے۔ جناب مولوی فضل امام صاحب نے فرمایا کہ بس حدِ ادب۔ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر تو ہے نہیں، فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ برخوردار تو سچ کہتا ہے۔ مجھ کو سہو ہوا تھا۔

مولانا کے ادبی مذاق کی غالبؔ کے دل میں بے انتہا قدر تھی۔ ایک زمانے میں انھوں نے ایک فارسی قصیدہ عرفیؔ کے جواب میں لکھا ہے۔ اس کی نقل مولانا کو بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"چوں کوششِ اندیشہ بجائے رسید کہ بہ عرفیؔ راحل ماندو بہ مرا آجا نگرید آں ابیات را بر کسے عرضہ میدارم کہ چوں منے صد و عرفیؔ صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد و پایۂ ہر یک تواند نمود"

آخری دو فقروں سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کہ مولانا فضلِ حق نے شعر و سخن میں غالبؔ کی راہنمائی کی تھی۔

نواب حسام الدین حیدر خاں، غالبؔ کے خسر مرزا الٰہی بخش معروفؔ کے چاہیتے دوست تھے اور آبِ حیات میں ان کی تعریف میں معروفؔ کا شعر نقل ہوا ہے ؎

جو آؤ تم مرے مہماں حسام الدین حیدر خاں
کروں دل نذر، جاں قرباں، حسام الدین حیدر خاں

لیکن وہ مرزا غالبؔ کے بھی "بچپن کے دوست" تھے۔ اور حالیؔ کے بیان کے مطابق انہی نے مرزا کے اشعار میر تقی میر کو اس زمانے میں سنائے تھے۔ جب ابھی مرزا کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ انہیں خود شاعری کا شوق تھا اور مرزا نے ان کے اردو

دیوان پر ایک فارسی دیباچہ لکھا ہے۔ ان کی وفات ۱۸۸۴ء میں ہوئی ان کے بیٹے نواب حسین مرزا جو اسی سال بہادر شاہ کے ناظر مقرر ہوئے۔ غالب کے دلی دوست اور اس کے کمالِ فن کے مداح تھے۔ نواب حسام الدین حیدر خاں۔ میر مستحسن خلیق اور میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ جو صفائے زبان پر جان دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مذہباً شیعہ تھے۔ ممکن ہے ان کی صحبت میں وہ نئے اثرات اور زیادہ مضبوط ہو گئے ہوں گے۔ جو مرزا نے زبان اور عقیدہ کے بارے میں قبول کیے۔

نواب امین الدین احمد خاں جنہیں بڑے انقلابوں کے بعد بالآخر لوہارو کی ریاست ملی۔ دہلی میں مرزا کے تیسرے بڑے دوست تھے۔ ان کی چچی زاد بہن مرزا سے بیاہی تھیں اور وہ غالب کی فارسی شاعری کو بھی پسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہی نے مرزا کو فارسی دیوان مرتب کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن وہ غالب کی طرح رند آزاد طبع نہ تھے اور اخیر عمر میں واقعہ قید کے بعد ؟) غالب اور ان کے درمیان ایک طرح کا تکلف اور بُعد آگیا۔

جذباتی زندگی

شاید دوست احباب کے اثر سے بھی زیادہ اہم مسئلہ داخلی جذباتی زندگی کا ہے۔ جو کسی ڈھب پر نہ آئے تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی انتشار ہی رہتا ہے۔ غالب کی رنگین جوانی کا ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دہلی آنے کے چند سال بعد ان کی "دنیائے دل" میں ٹھہراؤ اور توازن آگیا۔ اس کی واضح شہادت ان کی مشہور اردو غزل ہے جو یقیناً کسی غمگسار محبوبہ کا نوحہ ہے۔"

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اس غزل کے اشعار اور باقی شواہد سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا کی یہ دلبستگی "جوانی دیوانی" کا ایک عام مظاہرہ نہ تھا۔ بلکہ غالب کو محبوبہ سے اور اسے غالب سے گہری اور

حقیقی محبت تھی۔ غالب نے عمر بھر اس سانحہ پر اشکِ غم بہائے اور جہاں تک محبوبہ کا تعلق ہے اس کی محبت اور جاں نثاری غالب سے بھی بڑھ کر تھی۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی مری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

غالب نے یہ غزل پچیس برس کی عمر سے کافی پہلے لکھی ۔ نسخہ ۔ میں موجود ہے اور پہلے مقطع میں تخلص اسد تھا، اس میں درد اور خلوص ہی نہیں، صحت مند نشاطِ کامرانی کی جھلک بھی ہے اور تمام غزل میں کچھ اس طرح کا رکھ رکھاؤ، معاملہ فہمی اور وقار ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اس وقت تک غالب کے جذبات نے ایک متوازن صورت اختیار کرلی تھی۔

طرزِ شاعری میں انقلاب

مرزا نے قیامِ آگرہ کے دوران میں ہی شعر و سخن میں اتنی شہرت حاصل کرلی تھی کہ شعراء کے تذکروں میں ان کا نام آنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ عام فہم شعر بھی کہتے تھے۔ اور کہہ سکتے تھے۔ لیکن جیسا کہ نواب اعظم الدولہ نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں لکھا ہے اس زمانے میں وہ بیدل کے اثر سے مسحور تھے۔ اور طبع مشکل پسند خیال بندی کی طرف مائل تھی۔ مرزا اپنے ابتدائی ایام اور آغازِ شعر کی نسبت لکھتے ہیں:-

غالبم لبسبز کہ بہ فریب پندار آزادہ روی بہ سخن لا اُبالیانہ پرداختم، و اندازہ ارزشِ سخن و پایۂ والائی گہرِ خویش نشناختم۔ سینۂ من نفسے واشت بہ روز آسائی نسیمے کہ از بستر زار وزد۔ زبان زدہ من ؛ کہ دم جز بہ نا بایست نزدمے۔ بنانِ مرا قلمے بُودے بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد۔ بیہدہ کوش

من! کہ باراں بہ شورہ زار فرو ریختیم ؎

با ایں فروغِ گوہر درخشانیٔ نہاد

زیں ساں سیاہ روزِکرا کرد روزگار

اُردُو زبان طرزِ بیدلؔ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اور مرزا کے نتائج طبع کے قدردان تھوڑے تھے۔ لیکن آگرے میں شعرا اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی۔ جو دہلی میں تھی اور غالب کے عجیب و غریب اشعار پر جب یہ لوگ معترض ہوتے تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ اُنھوں نے آگرے میں ایک رُباعی لکھی تھی ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل | ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کے جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش | گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب مرزا دہلی آئے اور مولانا فضلِ حق اور دوسرے مسلّمہ استادوں نے انہیں ان اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور جس طرح انھوں نے مندرجہ بالا رباعی کا دوسرا مصرع بدلا۔ اور اپنے معترضوں کو بجائے "جاہل" کے "سخنورانِ کامل" کہا۔ یا اس زمانے کے ایک فارسی شعر میں لکھا ؎

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اسی طرح اپنی شاعری کا رُخ بدلا۔ اور مشکل زبان اور خیالی مضامین چھوڑ کر ایک شگفتہ اور عام فہم اندازِ بیان اختیار کیا۔

دہلی آنے کے بعد مرزا نے جس تیزی سے اپنا اسلوبِ شاعری بدلا اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا بہترین اُردو قصیدہ اور ذیل کے مطلعوں والی اردو غزلیں

۲۴ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد | بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک | کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

درد سے میرے ہے مجھ کو بیقراری ہائے ہائے | کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی | مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ ہوئی ! | امتحاں اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی

کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے | ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مرزا غالب کے منتخب دیوانِ ریختہ کی نسبت آزاد کا بیان ہے کہ یہ انتخاب مولینا فضل حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا۔ مرزا کے اپنے بیان اور معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ انتخاب خود غالب نے کیا۔ غالباً یہ خیال درست ہے۔ لیکن مرزا کے ابتدائی اور بعد کے طرزِ شاعری میں اتنا فرق ہے کہ یہ بیان بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس میں کسی خارجی رہنمائی کو بھی دخل تھا اور بقول مرزا "انھوں نے اپنا طرزِ خاص اس لیئے ترک کیا کہ اسے یاروں نے چلنے نہ دیا" (جلوۂ خضر)

شروع میں مرزا کی اصل توجہ اردو کی طرف تھی۔ کبھی کبھی فارسی شعر کہہ لیتے تھے۔ لیکن ۱۸۲۵ء کے قریب انھوں نے فارسی پر زیادہ توجہ شروع کی۔ اور کوئی بیس سال تک اردو کی حیثیت ثانوی اور ضمنی رہی۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ ان کی شاعرانہ اولوالعزمی نے اب فن کی زیادہ کٹھن منزلیں پیش نظر رکھیں۔ اور دوسری وجہ ذوق کی حریفانہ چشمک تھی جس کا ذکر انھوں نے ایک ابتدائی فارسی قصیدے میں کیا ہے ؎

ملالِ خاطرِ حاسد زمن بداں ماند — کہ گردِ راہ بہ ہوا پیچد از سبکساری

چہ ننگ اگر بہ سخن ہم فنست آں چوں بسخن — زدودہ ام ز ورق داغِ ننگِ ہمکاری

فارسی شعراء

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کا ایک اہم سبب ہندوستان کے فارسی شعراء کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب بجائے میر اور سودا کے انہیں بیدل اور عرفی کا جانشین سمجھا جائے۔ بیشک انھوں نے اردو اشعار لکھے۔ لیکن کسی اردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اردو میں بھی پہلے بیدل اور بعد میں عرفی اور نظیری کے طرز میں شعر لکھے۔ وہ میر کے مداح تھے۔ لیکن میر کی غزلوں پر بھی انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں۔ وہ میر نہیں بلکہ بیدل کے رنگ میں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کے ابتدائی اشعار اردو میں ہیں۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔ مرزا اپنے اردو اور فارسی کلام میں وہ حدِ فاصل نہیں رکھتے تھے۔ جو اس زمانے میں فارسی سے عوام کی ناواقفیت کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ وہ گلِ رعنا کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ میں نے اردو شعر گوئی میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو فارسی شاعری میں روا رکھا تھا۔ مرزا کی شاعری بقول ان کے ایک باغ کی طرح ہے جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک اردو اور ایک فارسی یعنی یوں سمجھیے کہ اردو اور فارسی اشعار دونوں ایک ہی باغ کے گلہائے شاداب ہیں۔ انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور غالب کے مقابلہ میں باقی اردو شعراء کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان شعراء کی نظر دلی سے آگے نہ جاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ شادابی اور تنوع نہیں۔ جو مرزا کے کلام میں ہے جن کی روایات کا سلسلہ عرفی۔ بیدل۔ ظہوری۔

عُرفی اور نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہونچتا ہے۔ مرزا غالب کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ انھوں نے ہندی فارسی ادب کی تمام روایات کو اپنی شاعری میں سمو لیا ہے سہ

نگہ بیم تازہ دارم شیوۂ جادوں بیانان را — دلے در خویشتن بینم کارگر جادوئے آنان را

اور اس سے بھی بڑھ کر سہ

عیارِ فطرت پیشینیاں زما خیزد
صفائے بادہ ازیں دُرد تہ نشیں پیدا ست

مرزا نے آغاز بیدلؔ کے رنگ سے کیا۔ لیکن جب انھوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا اور "شیخ علی حزیںؔ نے مسکرا کر ان کی بیراہ روی انہیں جتائی۔ اور طالب آملی اور عُرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا فنا کر دیا۔ اور ظہوری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا" تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات زیادہ آگئیں اور روشیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ نکلے جس میں بیدلؔ کی شعریت فنا ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں دکھائیں گے۔ مرزا کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے جو اردو کے اور شعرا میں نہیں۔ لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکبری شعرا کی ذہنی معاملہ بندی ہے۔ جو عُرفی اور دوسرے شعرا میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی۔ لیکن جسے مرزا نے وسعت دے کر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا۔ مرزا کو دہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن فارسی اشعار پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقعہ انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا۔ اور ہمارے خیال میں ان کی شاعری پر خارجی اثرات

میں سب سے اہم فارسی شعراء کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے۔

مرزا غالب کا رنگِ طبیعت عُرفی سے ملتا تھا۔ اس لیے ان کے اشعار میں عرفی کا زورِ بیان، جدت اور بلند پروازیاں ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رنگِ بیدل کو ترک کرنے کے بعد غالب نے سب سے زیادہ ظہوری کی پیروی کی۔ ان کی فارسی نثر میں ایک زمانے تک سہ نثرِ ظہوری کا رنگ نمایاں رہا۔ اور فارسی اشعار میں جس کثرت سے انھوں نے ظہوری کی تعریف کی ہے کسی اور کی نہیں کی ؎

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید | سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم
ما را مدد ز فیضِ ظہوری است در سخن | چوں جام بادہ راتبہ خوار خودیم ما
بنظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب | رگِ جاں کردہ ام شیرازۂ اوراقِ کتابش را
غالب از صہبائے اخلاقِ ظہوری سرخوشیم | پارۂ بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما
غالب از جوشِ دم ما تربتِ گلپوش باد | پردۂ سازِ ظہوری را گل افشاں کردہ ایم
غالب از من شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ گشت | از نوا جاں در تنِ سازِ بیانش کردہ ایم
زلہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث چیست | در سخن درویشے باید، نہ دکاں دارئے

مثنوی بادِ مخالف میں انھوں نے اپنے محسن فارسی شعراء کے نام گنائے ہیں۔ اور ان میں بھی جس انداز سے ظہوری کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا | طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روانِ معنی را | آں ظہوری جہانِ معنی را
آنکہ طے کردہ ایں سوقعنا را | چہ ثنا سد تقیل ووا قفنا را

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ اور بالخصوص خاصہ کا لفظ غور طلب ہے۔

ذہنی ارتقاء

اس کے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا وہ بڑی حد تک اُس انقلاب کا عکس تھا جو مرزا کی ذہنی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت کم ہوتی گئی۔

عنفوانِ شباب میں انسان اپنے تئیں دنیا کا مرکز سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ میری رائے اور پسند کے سامنے سب کو سر جھکانا پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ رُجحان جیسا کہ ان کے خاص طرزِ شاعری یا ان کے بھائی کی علالت سے بھی خیال کیا جاسکتا ہے، عوام سے بہت زیادہ تھا۔ نفسیات کے اصول کے مطابق ایسی انتہائی انفرادیت کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھا کر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھ کر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے۔ کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے کہ اپنا امتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سٹری پن بھی نہ ہو۔ یہ اُردو ادب کی خوش قسمتی تھی کہ مرزا کے طبعی رجحانات پر ان کی عقلِ سلیم غالب آئی۔ اور انہیں ایسے دوست میسّر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بے قاعدگیاں ہموار کر دیں۔ شخصی انفرادیت مٹانے اور مناسب حسِ تناسب سکھانے کے لیے سوسائٹی کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے۔ جسے کنجِ تنہائی سے بزمِ احباب زیادہ راس آتی ہے۔ جب مرزا کا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زود حسی کم ہوئی تو ان کی انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آگئی۔ اور عجیب و غریب خیالات اور

منشیانہ تکلفات کو ننا ہا ہے۔ لیکن اردو رقعات میں مندرجہ بالا اصولوں پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ اور بقول خود "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ دور سے بیٹھے بزبان قلم باتیں کیا کیجیئے۔"

اس رسالے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی زبان دانی سے جو نفرت مرزا کو تمام عمر رہی اور جس نے بعض اوقات تلخ بحث کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس وقت بھی موجود تھی۔ چنانچہ وہ فارسی لکھنے والے کو ہدایت کرتے ہیں۔ "اندازۂ خوبیٔ زباں نگاہ دارد و ایں پارسی آمیختہ بتازی را در کشاکش تصرفات ہندی زبانانِ پارسی نویس ضائع نگزارد۔"

یہ رسالہ جو مرزا نے تین روز میں ختم کر دیا۔ بیشتر خطوط کے القاب و آداب اور دُعائیہ فقروں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس سے مرزا کی ذہنی نشوونما اور اصلاحِ مذاق پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یوں ہی مرزا علی بخش کی اس درخواست سے کہ مرزا ان کے لیئے خط و کتابت کے اصول و قواعد جمع کریں۔ اور ان کے اس بیان سے کہ "مہین برادرِ قدسی اثر جناب اسد اللہ خاں متخلص بہ غالبؔ ..... از راہِ کہتر نوازی سرے بآموزگاری من داشت۔" یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب مرزا غالبؔ کے علم و فضل کا اعتراف کیا جا رہا تھا۔ دوسرے فارسی رسالہ کے چند صفحات سے ہی نظر آ جاتا ہے کہ ان کا مصنف "طرزِ بیدلؔ" کی بھول بھلیاں سے بہت آگے گذر چکا ہے۔ اب نہ بیان میں اشکال ہے نہ خیالات میں غرابت پسندی۔ طبیعت کی بے راہ روی اور وارفتگی رخصت ہو چکی ہے۔ بلکہ "قواعد و قوانینے کہ قرار دادۂ ایں مردم است" کی پابندی کا مشورہ ہے۔ خطوط نویسی اور اسلوب بیان کی جو نصیحتیں ہیں۔ وہ سب پُر مغز اور عملی سوجھ بوجھ پر مبنی ہیں۔ اور ایسی نہیں۔ کہ آپ انہیں فنِ انشاء کی عام کتابوں میں

طبیعت کی یبوست کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی۔

انشائے غالبؔ

قیام دہلی کے دوران میں مرزا کے مزاج میں جس طرح پختگی اور متانت آگئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے ایک مختصر فارسی رسالہ سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ۱۸۲۵ء یعنی ۲۸ برس کی عمر میں لکھا۔ مرزا علی بخش نے جن کی ہمشیرہ مرزا سے بیاہی تھیں۔ غالبؔ سے استدعا کی کہ فارسی خط و کتابت کے قواعد اور القاب، خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیں۔ چنانچہ مرزا نے چند صفحات کے ایک رسالے میں فارسی مکتوب نویسی کے قواعد مرتب کیے۔ یہ رسالہ صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہوا ہے اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا۔ (اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں) اس وقت بھی انہیں پسندِ خاطر تھا۔ وہ اس رسالے میں لکھتے ہیں:-

مکتوب الیہ را لفظے کہ فراخورِ حال اوست آواز دہم و زمزمہ سنجِ دعا گردم القاب و آداب گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است۔ وپختگان حشو را دفع نہند۔ نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گذارش دور تر نہ بردہ نبشتن را رنگِ گفتن دہد۔"

فارسی خطوط میں انھوں نے ایک حد تک رواجِ عام کی پیروی کی ہے۔ اور

۱؎ بعض نقاد مرزا کے خاص اسلوب مکتوب نویسی کو سفرِ کلکتہ کی سوغات اور فورٹ ولیم کالج کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ کاش وہ ان سطور کو دیکھ لیتے جو مکتوب نویسی اور اندازِ تحریر کے متعلق غالبؔ نے سفرِ کلکتہ سے تین سال پہلے لکھیں۔

پالیں۔

اس مختصر سے رسالہ میں مرزا نے جو کام کی باتیں جمع کردی ہیں۔ ان کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہو سکتا ہے :۔

"نامہ نگار را باید کہ مطلب را بداں روش گذارد کہ دریافتن آں دشوار نبود۔ و اگر مطلبے چند داشتہ باشد۔ در تقدیم و تاخیر زرف نگہی بکار برد و ازاں پرہیزد کہ در سخن گرہ در گرہ گردد و اجزائے مدعا بہمدگر فرو خورد۔ نہ نہار استعارہ ہائے و لغات مشکلہ نامانوس در عبارت درج نکند و در ہر نورد رعایت رتبۂ مکتوب الیہ در نظر دارد۔ تا تواند سخن را درازی ندہد۔ و از تکرار الفاظ محترز باشد۔ و بیشتر بمذاق اہل روزگار حرف زند و از احاطۂ قواعد و قوانینے کہ قرار دادۂ ایں مردم است بدر نہ رود .... و پیوستہ دراں کوشد کہ سادگی و نغزی شعار او گردد۔

در اقسام مکاتیب، خاصہ در خطوط و عرائضے کہ بحکام نویسد و مشتمل بر معاملات باشد از اغلاق و اغراق احتراز واجب داند و سخن با استعارہ و اشارہ نگزارد و نرم گوید و سنجیدہ گوید و آساں گوید۔"

آگے چل کر اس امر پر بڑا زور دیا ہے کہ دوستانہ خطوط میں بھی حفظِ مراتب کا خیال رکھا جائے۔ لکھتے ہیں :۔

"پوشیدہ مباد۔ کہ درمیانِ احباب مراسلات متفاوت است۔ مجملاً القاب ہا نگاشتہ می آید۔ ہر کہ درخور حفظ ہر رتبہ باشد۔ رعایت آں ملحوظ باید داشت و آں اینست کہ مدمیزانِ متصدیان شفیق بر مشفق و مشفق بر مہرباں سے چربد۔

ذکر مغرمائے مخلصاں برکر مغرمائے دوستاں تفوق دارد۔

اس سلسلے میں ہائے کوچک (ہ) اور ہائے کلاں (ح) [مہربان اور محربان] کا قصہ لکھ کر اپنے زمانے کے والیانِ ریاست کے مذاق کو بے نقاب کیا ہے اور حکیمانہ پیرائے میں نیرنگئ قدرت کا نقشہ کھینچا ہے:

حکایت:۔ کہتے ہیں راجہ بھرتپور کی سرکار میں ایک پرانا منشی تھا۔ جو راجہ صاحب کے خطوط و مراسلات لکھا کرتا تھا اور اپنی انشاء پردازی پر بڑا ناز کرتا تھا۔ اتفاق سے راجہ صاحب اس سے کسی بات پر بددل ہو گئے اور مراسلت نگاری کی خدمت کسی اور کے سپرد کردی۔

معزول منشی اپنے زوال پر خون کے گھونٹ پیتا تھا۔ اور اس بات کی تاک میں تھا کہ نئے منشی کی کوئی غلطی پکڑے۔ اور اپنی بحالی کا انتظام کرے۔ اتفاق سے اس کا جلدی موقع ہاتھ آگیا۔ ایک دفعہ راجہ صاحب نے اپنے عزیز دوست کے نام خط لکھوایا۔ جب نیا منشی یہ خط لکھ چکا اور سرنامہ بھی مکمل کرلیا۔ تو منشی معزول نے اس سرنامہ کو دزدیدہ نگاہی سے دیکھ دیکھ کر سر ہلانا اور مسکرانا شروع کیا۔ راجہ صاحب نے سمجھا دال میں کچھ کالا ہے۔ چنانچہ انھوں نے منشئ معزول سے استفسار کیا۔ اس پر وہ ہاتھ جوڑ کر اور مراسمِ مدح وثنا بجالاکر کہنے لگا:۔

"حضور! ہم پرانے نمک خوار سرکار کے سچے خیر خواہ ہیں۔ لیکن نووارد نوکروں کو نمک اور خیر خواہی سرکار کا کیا پاس؟ بالخصوص یہ شاہ جہاں آباد کے اہلِ قلم تو بالکل نمک حرام اور حبِّ سرکار سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔

مثلاً حضور کا نیا منشی، آپ کے عزیز ترین دوستوں کو، جن کی حضور بڑی قدر کرتے ہیں اور جن کی دوستی سرکار اپنے لئے مفید اور سودمند سمجھتے ہیں۔ ہائے کوچک سے مہربان

لکھا ہے۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ انہیں ازراہِ تعظیم ہائے کلاں سے محربان لکھا ہے اب جو آپ کے دوست اپنی تعظیم وتکریم میں یہ کمی دیکھیں گے۔ تو ضرور ہے کہ ان کا دل آزردہ ہو، اور حضور اور ان کے تعلقات میں فرق آئے۔

اس پر راجہ صاحب بہت بگڑے نئے منشی کو بلایا۔ اور بڑی خفگی سے اس سے کہا کہ تم کون ہو۔ جو ہمارے ان دوستوں کو جنہیں ہمیشہ ہماری سرکار سے ہائے کلاں سے محرباں لکھا جاتا تھا۔ اب ہائے کوچک سے مہرباں لکھتے ہیں۔ شاید تمہارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے دوست ہمارے دشمن ہو جائیں؟

غرضیکہ راجہ صاحب نے نئے منشی کو موقوف کیا اور قدیم منشی کو انعام واکرام دے کر اپنا دفتر انشاء پھر سے اس کے سپرد کیا!! فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارُ (ترجمہ)

دلی کے سازگار ماحول میں مرزا کا آئینۂ طبیعت ابتدائی زنگ اور میل سے صاف ہو گیا۔ اور معنی گستری اور سخن پروری کی جو بلند منزل انھوں نے نظر کے سامنے رکھی تھی۔ اس تک پہونچنے کی صلاحیت ان میں بہت بڑھ گئی۔ لیکن اس منزل تک پہونچنے سے پہلے انہیں ایک مدت تک تلاشِ معیشت کی وادی میں سرگرداں رہنا پڑا!! اس کی تفصیل ہم آئندہ باب میں دیں گے۔

غمِ روزگار

پنشن کا قضیہ

غالب کا فارسی رسالہ اخیر ۱۸۲۵ء میں لکھا گیا۔ اگرچہ اس سے غالب کی جائداد کے جھگڑوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی لیکن غالباً ان کی ابتدا اسی زمانہ میں ہو گئی تھی۔ نواب احمد بخش رئیس فیروز پور جھرکہ و لوہارو کے تین صاحبزادے تھے۔ نواب امین الدین۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشاں اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی نواب شمس الدین۔ نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے نواب شمس الدین کو تمام جائداد کا وارث قرار دیا تھا۔ لیکن اس فیصلے سے دوسرے بھائی خوش نہ تھے۔ اس لیئے اس میں بعد کو ترمیم ہوئی۔ اور فروری ۱۸۲۵ء میں اپنے والد کے ایما پر نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو چند شرطوں کے ماتحت اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا۔ اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں باقی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔

چونکہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی۔ اس لیئے

ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا زیادہ احساس اسی زمانے میں ہوا ہوگا۔ جب نواب احمد بخش نے اپنی جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ کیا۔ مرزا کو جاگیر اپنے چچا مرزا نصراللہ بیگ کے وارث ہونے کی حیثیت سے ملی تھی۔ جن کی وفات پر اُن کی جاگیر نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی۔ اور نواب نے اس کے عوض ان کے ورثاء کی نگہداشت کا ذمہ لیا تھا۔ مرزا نصراللہ بیگ کی اولاد کوئی نہ تھی۔ اور ان کے وارث مرزا غالبؔ، مرزا یوسف اور مرحوم کی ماں بہنیں تھیں۔ مرزا غالبؔ کا دعویٰ تھا کہ "مرزا نصراللہ کے شرکائے حقیقی کے لیے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی" لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے، جن میں مرزا کا حصہ صرف ساڑھے سات سو روپے سالانہ تھا۔

ہم لارڈ لیک کے اس فیصلہ (مورخہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء) کا جس پر مرزا غالبؔ کے دعوے کی بنیاد تھی اور اس شقہ (محررہ ۷ جون ۱۸۰۶ء) کا جس پر نواب کا عملدرآمد تھا۔ ذکر کر چکے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ مرزا کو اس شقے سے بے خبری تھی۔ لیکن اتنی دیر تک انہیں اس کی رو سے فقط ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ ملتا رہا۔ اور انھوں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ ممکن ہے۔ نواب نے اصل رقم کے متعلق اپنی جائداد کے آخری فیصلہ تک معاملہ کو مگو رکھا ہو یا گاہے گاہے ان سے جو فالتو فتوحات حاصل ہو جاتی تھی۔ انھوں نے غالبؔ کی زبان شکوہ پر مہر لگا دی، شاید ایک وجہ یہ تھی کہ خواجہ حاجی کو جو رقم ملتی تھی اس کے متعلق مرزا کا خیال تھا۔ کہ اس کی وفات پر یہ رقم بند ہو جائے گی۔ اور ان کی ادائیگی میں اضافہ ہوگا۔ لیکن جب ۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی کی وفات ہوئی

اوران کا حصہ ان کے بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین خاں عرف خواجہ امان، مترجم بوستان خیال، کو منتقل ہوا۔ تو مرزا غالب کو صحیح حالات کا اندازہ ہوا۔

۱۸۲۶ء کا سال مرزا کے لیئے بڑا نامبارک تھا۔ اُن کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جو نواب احمد بخش کے بھائی تھے اس سال وفات پاگئے اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد مرزا کو نواب کے متعلق زیادہ تشویش پیدا ہوگئی ہو۔ اس کے علاوہ مرزا کی پنشن نواب شمس الدین کی جاگیر سے متعلق ہوگئی تھی اور چونکہ مرزا کے روابط ان کے مخالفین سے تھے۔ انھوں نے پنشن کی ادائیگی میں بے قاعدگی شروع کی۔ بہرکیف جو رقم انہیں ملتی تھی۔ بہت تھوڑی تھی۔ مرزا کی عمر اس وقت تیس انتیس سال کی تھی۔ اور تمام عمر عیش وعشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش ومسرت کا سرچشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ابتدائی توقعات کی بنا پر قرضے دیئے تھے۔ وہ اب مختصر پنشن دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے، اور ایک بڑا حادثہ اس موقعہ پر یہ ہوا کہ مرزا کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہوگیا:

فیروزپور جھرکہ کا سفر

غالب کی حساس طبیعت کے لیئے ذریعۂ معاش کی تنگی، بھائی کی بیماری، قرضخواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابل برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ نواب کی خدمت میں اپنا دکھ درد[۱] بیان کرو۔ ممکن ہے کہ وہ الجھنوں کا کوئی حل نکال لے۔ چنانچہ مرزا

---

[۱] مرزا نے اس زمانے میں مولانا فضل حق کے نام صنعت تعطیل میں جو خط لکھا تھا۔ اس سے اس سفر کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے (کلیات نثر غالب صفحہ ۶۳ - ۶۴)

دہلی سے فیروز پور جھرکہ گئے۔ نواب ان دنوں الور میں تھا۔ اور اپنی پریشانیوں میں گرفتار۔ اس لیئے مرزا کو فیروز پور جھرکہ رُکنا پڑا۔ یہاں سے انھوں نے جو خطوط اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے چھجمل کھتری کے نام لکھے ہیں۔ ان سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"چہ نالہ ہا کہ از بیم رسوائی از دل تا بہ زبان نرسیدہ خون میگردد و چہ خونہا کہ از دیدہ بہ بیکسی کسوتِ اشک پوشیدہ از چشم بیرون میرود۔ چارۂ رنج بیدلی معدوم و پایان کار نامعلوم است۔ پیدا است کہ از قفس بدام اُفتادہ را چہ حال خواہد بود"

اس کے بعد نواب کے انتظار میں جو بیقراریاں ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر کرکے لکھا ہے:۔

"ہر چند در وطن نیم اما قربِ وطن نیز قیامت است۔ ہنوز با اہلِ کاشانہ راہ نامہ و پیام است۔ ہر چہ دیدہ مے شد آشوبِ چشم بود و ہر چہ شنیدہ میشود زحمتِ گوش است۔ نیم جانے کہ ازاں ورطہ برون آوردہ ام ودیعتِ خاک فیروز پور است کہ مرا ایں اقامتِ اضطراری اتفاق افتاد"

آخر جب خدا خدا کرکے نواب الور کے قضیوں سے فارغ ہوا اور فیروز پور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورے سے امید دل سے جو قلعے بنائے ہوئے تھے' ان کی بنیاد ریت پر ہے اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے۔ چنانچہ بقول غالبؔ "نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریفتند و بکرشمۂ سخنے کہ بالتفات می مانست از راہ بردند" اور مرزا کو دہلی ناکام واپس آنا پڑا۔

مرزا کو جب نواب صاحب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی۔ تو انھوں نے نواب کے خلاف کلکتہ میں جہاں اس وقت حکومت ہند کے دفتر تھے۔ اپیل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور وہ تیس اکتیس برس کے ہوں گے جب وہ اس دور دراز سفر کے لیئے گھر سے روانہ ہوئے۔

لکھنؤ

مرزا دہلی سے کب روانہ ہوئے۔ اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن دہلی سے وہ لکھنؤ گئے جہاں وہ کئی مہینے مقیم رہے۔ اور وہاں سے ان کی تاریخ روانگی ۲۷ر جون ۱۸۲۷ء یا ۲۶ر ذیقعد ۱۲۴۲ھ ہے۔

مرزا جب لکھنؤ پہنچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ مسند نشینی کے پانچ سال بعد تک تو وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے لیکن جب ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے شاہ دہلی سے بگڑ کر نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اور حضور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا، تو غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی کی تقریب ہوئی جس کی ناسخ نے تاریخ کہی۔ ع

بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

غازی الدین حیدر کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر تھے جن کا زمانہ اقتدار تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے لیکن غالب کا معاملہ ان کے با اقتدار نائب سبحان علی خاں کنبوہ سے تھا جو دفتر انشاء کا مہتمم اور وزیر کا دست راست تھا۔ مرزا چاہتے تھے کہ غازی الدین حیدر کی تعریف میں انھوں نے جو زبردست قصیدہ لکھا تھا اس کا

انہیں اتنا صلہ ملے کہ سفر کلکتہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ لیکن ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ بلکہ پہلا ہی قدم ٹیڑھا پڑا۔ اور نائب وزیر سے بھی ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ (بقول حالی) مرزا غالب بطور ایک رئیس کے، اس امر کے متمنی تھے کہ بوقت ملاقات نائب انہیں تعظیم دیں اور دوسرے انہیں نذر سے معذور رکھا جائے۔ نائب نے اسے منظور نہ کیا۔

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آنچہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوۂ خاکساری بود۔"

انھوں نے جا بجا آغا میر کی بد انتظامی اور بے انصافی کی شکایت کی لیکن ان کے کام میں اصل رکاوٹ سبحان علی خاں کنبوہ کی طرف سے تھی جو انہیں ایک مدح گو شاعر سے زیادہ سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرزا ان کے طریق کار سے برافروختہ ہوئے تو مولوی کرم حسین خاں سفیر شاہ اودھ کے پاس فخر الدولہ نواب امین الدین احمد خاں کی سفارش پہنچائی اور انہیں لکھا کہ ان کا مرتبہ سبحان علی خاں صاحب کے بیان کے مطابق نہ ہونا چاہیئے:۔

"چہ ایشاں آبروئے خاکسار بہائے مسائل در نظر ندارند و حبہ شاعر صلہ جوئے نہ شمارند۔"

غازی الدین حیدر کی بادشاہت اور آغا میر کی وزارت میں (وزیر جیسے یا شہریار جیساں) کسی بے انصافی یا بیقاعدگی کا ہونا خلاف توقع نہیں لیکن ملاقات کے سلسلے میں مرزا کو لکھنؤ میں جو کچھ پیش آیا۔ اس کا اصل باعث مرزا کی شاعری اور جاگیرداری کی وہ کشمکش تھی جس کے بعض دوسرے مظاہرے بھی ہوئے (مثلاً دہلی کالج کی ملازمت کے وقت) زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ اگرچہ بادشاہ کی تعریف کا قصیدہ اور وزیر کی تعریف کی نثر سبحان علیخاں تک پہنچ چکے تھے (جیسا کہ مرزا نے نائب کے نام ایک خط میں لکھا ہے) وزیر کی مجلس میں پڑھ کر سنائے بھی گئے لیکن نہ کسی نے ان کی

سلہ مرزا نے یہ قصیدہ (دہلی سے؟) پہلے شاہ اودھ کے وکیل راجہ رام ... اور پھر منشی محمد حسن کے پاس بھیجا کہ وہ آ وزیر

قدر کی۔ اور نہ کسی شاعر کی مشکلات و مصائب کا کچھ خیال آیا۔

مرزا بقولِ خود اس وقت "نو آموز شیوۂ گدائی تھے۔ قصیدہ میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے ؎

ناز پروردۂ خلوت گہِ آزادگیم — کافرم گر بسرا پردۂ سلطاں رفتم
من ہم از خیلِ کریمانم و خجلت نبود — گر بدریوزہ بدرگاہِ کریماں رفتم

اس قصیدے میں جس کی زبان بہت صاف ہے۔ مرزا نے اپنی مصیبتوں اور دہلی سے لکھنؤ جانے کی دردناک داستان لکھی ہے ؎

تا نباشد اثرے ترکِ وطن نتواں کرد — مشکلے در نظر آوردم و آساں رفتم
چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں — خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنواں رفتم

نوٹ بقیہ ص ۷۲۔ تک پہنچائیں۔ اور وزیر اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے۔ مرزا نے اس کے ساتھ منشی محمد حسن کو ایک خط لکھا جس میں وہ کہتے ہیں:۔ "بود کہ مرا بہ جائزۂ بادخوانی و صلہ مدح گستری ایں مایہ سامان فراز آید کہ خود را اگر د آوردہ بہ کلکتہ توانم برد و کارے توانم کرد"۔ اس خط میں تاریخ کتابت یا بادشاہ یا وزیر کا نام درج نہیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ قصیدہ لکھنؤ کب بھیجا گیا۔ اور کیا شروع سے ہی اس میں نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ کا نام تھا یا پہلے غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ کا نام تھا اور چونکہ ۱۸۲۷ء میں پیش نہ ہو سکا۔ اس لئے بعد میں ناموں کی تبدیلی سے نصیر الدین کے دربار میں پیش کیا گیا۔ قصیدہ کے مضامین سے موخر الذکر نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس قصیدہ کے اشعار گلِ رعنا کے دیباچہ میں منتخب ہوئے ہیں۔ اس لئے غالباً یہ نظریہ صحیح ہے۔

اضطرارِ آئینہ پروازِ جلائے وطن است — نہ بدل رفتم ازاں بقعہ بل از جاں رفتم
ہم جگر تفتہ زکین خواہیِ اغیار شدم — ہم دل آزردہ ز بے مہریِ خویشاں رفتم
ایمن از فتنۂ عیاریِ عیّارانم — با چنیں تجربہ کز یاریِ یاراں رفتم

منّت از خویش بر اندازۂ طاقت دارم!
کہ بدیں بارِ الم ہائے فراواں رفتم

غالب لکھنؤ سے ۲۷ جون ۱۸۲۷ء میں روانہ ہوئے اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ نصیر الدین حیدر جو اُن کے بیٹے کہلاتے تھے تخت نشین ہوئے۔ اس کے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت تھے تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت سے مرزا کا مذکورۂ بالا قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا اور وہاں سے شاعر کو پانچ ہزار روپیہ دینے کا حکم ہوا۔ لیکن بقول ناسخ اس میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھائے۔ دو ہزار متوسط یعنی منشی محمد حسن نے۔ غالب بیچارے کو پانچ روپے بھی نہ ملے۔

مالی اعتبار سے مرزا کا قیام لکھنؤ بے نتیجہ ثابت ہوا۔ لیکن اس کی بدولت یہاں کے چیدہ لوگوں سے راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ اور فارسی کلیاتِ نثر میں متعدد خطوط ان بزرگوں کے نام ہیں جن کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ مثلاً شیخ امام بخش ناسخ۔ شیخ امیر اللہ سرور۔ نواب عاشق علی خاں سفیر اودھ اور ان کے صاحبزادے منشی امیر حسن بسمل۔ اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں۔ مظفر حسین خاں (ابن سبحان علی کنبوہ ؟؟؟) مولوی خلیل الدین خاں سفیر اودھ اور مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب جو غالب کے صحیح محسن ثابت ہوئے۔

غالب کی بعض تحریروں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں

اُردو شعر کم کہتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں فارسی کے قدردان تھوڑے تھے۔ اس لئے قرینِ قیاس ہے کہ اس جگہ انھوں نے اُردو اشعار زیادہ لکھے ہوں گے۔ یہ غزل تو یقیناً قیامِ لکھنؤ کی یادگار ہے ؎

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو !
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو !

پہلے اس غزل کے آخر میں ذیل کے قطعہ بند اشعار تھے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا غالبؔ ۔۔۔ ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنا ۔۔۔ ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید ۔۔۔ جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو

جب معتمد الدولہ کی طرف سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انھوں نے اشعار مندرجہ بالا کو بدل کر ذیل کا قطعہ درجِ دیوان کیا ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا یعنی ۔۔۔ ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر ۔۔۔ عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مرزا ۲۷ جون ۱۸۲۷ء کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور تین روز میں کانپور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے۔ جہاں مولوی محمد علی صدرامین نے مرزا سے سابقہ تعارف نہ ہونے کے باوجود ان سے بڑا نیک سلوک کیا۔ قیامِ باندہ میں انہیں آرام سے رکھا۔ اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں، مثلاً اپنے بھائی مولوی

سراج الدین علی خاں (قاضی القضاۃ کلکتہ) کے نام تعارفی خطوط دیئے۔ مرزا کا قیام باندہ اس لیئے بھی دلچسپ ہے کہ انھوں نے یہاں سے چند غزلیں اپنے کسی دوست کو بھیجیں جو قلمی نسخہ دیوانِ غالب (مملوکہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی) کے حاشیے پر درج ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ایک اور غزل میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے ؎

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

قلمی نسخے کے حاشیے پر اور بھی کئی غزلیں ہیں جن کے متعلق دیوان میں تو کوئی تصریح نہیں کہ وہ کب لکھی گئیں۔ لیکن جو سفرِ کلکتہ کا کلام معلوم ہوتی ہیں۔ ایک مقطع ہے ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

ذیل کی دردناک قطعہ بند غزل بھی اس قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

باندہ سے مرزا موڈا گئے اور موڈا سے چلہ تارا۔ یہاں سے انھوں نے کشتی لی اور دریا کے راستے الہ آباد پہونچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد میں جاتے

وقت یا واپسی پر کوئی ناخوشگوار ہنگامہ پیش آیا جس کی نسبت ایک فارسی قصیدے میں اشارہ ہے ؎

نفس بہ لرزہ زبادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ زہنگامۂ الہ آباد

بنارس

الہ آباد میں مرزا کا کچھ دیر توقف کا ارادہ تھا۔ لیکن غالباً اس کا موقع نہ ملا۔ اور وہ بنارس روانہ ہوئے۔ جس وقت بنارس پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ چنانچہ رائے چھجمل کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"چہ نویسم کہ از متاعِ نوشتنی ہا پر تہیدست افتادہ ام۔ اگر از داخلیات گفتہ آید۔ ہماں رنج معدہ وامعاست۔ وہماں برودتِ جگر و حرارتِ قلب وضعفِ قوی و اگر از خارجیات سخن راندہ شود بیش ازیں نیست قطعہ:۔

مغلوب سطوتِ غمِ دل غالبِ حزیں | کاندر تنش زضعف توان گفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است | ارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

بنارس پہنچتے وقت مرزا علیل تھے لیکن بنارس جس کے پُر فضا مناظر نے جزیں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں، غالب کے لیے بھی جنت نگاہ تھا۔ تھوڑے دنوں میں طبیعت بحال ہوگئی۔ اور اب سوائے اس کے کوئی افسوس نہ تھا، کہ ان کے عزیز دوستوں نے انہیں بھلا رکھا ہے۔ چراغِ دیر میں لکھتے ہیں ؎

کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست
مرا در دہر پنداری وطن نیست

اور مولوی فضل حق۔ نواب امین الدین اور نواب حسام الدین حیدر خاں کو یاد

کر کے افسوس کیا ہے ؎

گرفتم کز جہاں آباد رفتم | مرانیاں راچرا از یاد رفتم
مگو داغِ فراقِ بوستاں سوخت | غمِ بے مہریِ این دوستاں سوخت

اس کے بعد بنارس کی بہت تعریف کی ہے اور شاہجہاں آباد پر اسے ترجیح دی ہے ؎

جہاں آباد گر نبود الم نیست | جہاں آباد بادا جائے کم نیست
نباشد قحط بہر آشیانے | سرِ شاخِ گلے، در گلستانے
بخاطر دارم اینک گل زمینے | بہار آئینے، سوادِ دل نشینے
کہ می آید بدعویٰ گاہ لافش | جہاں آباد از بہرِ طوافش

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

مرزا کو بنارس بے حد پسند آیا۔ (چالیس برس بعد بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا!) لیکن جب پسماندگان کا خیال آتا۔ تو طبیعت بے قرار ہو جاتی ؎

فرو ماندن بکاشی نارسائی است | خدارا این چہ کافر ماجرائی است
بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر | درین جنت از آن ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن وا ماندۂ چند | بخونِ دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ | بامیدِ تو چشم از خویش بستہ
بشہر از بیکسی صحرا نشیناں | بروئے آتشِ دل جاگزیناں

ہمہ در خاک و خون افگندۂ تو   بحکم بیکسیہا بندۂ تو

چو شمع از داغ دل آذر نشاناں   بہ بزم عرضِ دعویٰ بے زباناں

از انانت تغافل خوشنما نیست

بہ دافع شاں ہوائے گل روا نیست

کلکتہ بنارس سے غالب کا ارادہ تھا۔ کہ باقی سفر کشتی سے طے کریں۔ لیکن چونکہ دریائی سفر کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ وہ گھوڑے پر روانہ ہوئے اور پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے ۲۰ رفروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہونچے۔ یہاں انھوں نے شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک فراخ مکان دس روپیہ کرائے پر لیا۔ اور حصولِ مدعا کے لیئے کوشش شروع کی سہ

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و زمے

از سینہ داغِ دوریٔ احباب شستہ ایم

مرزا ابھی کلکتہ نہیں پہونچے تھے کہ انھیں خبر ملی کہ نواب احمد بخش جن کی تقسیم کے خلاف مرافعہ کرنے کے لیئے وہ دہلی سے نکلے تھے وفات پاگئے۔ انھوں نے جائداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا۔ اور اب مرزا کا تنازعہ اُن سے اور اُن کے ساتھیوں بالخصوص خواجہ حاجی کے قرابت داروں سے تھا۔ یہ لوگ بھی با اثر تھے۔ بالخصوص مرزا افضل بیگ، جن کی ہمشیرہ خواجہ حاجی سے بیاہی تھیں کلکتہ میں بادشاہ دہلی کی طرف سے سفیر تھے۔ انھوں نے اپنا اثر اور رسوخ اپنے یتیم بھائیوں کے لیئے استعمال کیا۔ شروع شروع میں جب مرزا کلکتہ میں حکام سے ملے تو انھیں کامیابی کی بہت امید بندھ گئی۔ اس وقت فارسی دفتر کے سکرٹری

اینڈریو سٹرلنگ تھے۔ اور اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر سائمن فریزر۔ موخر الذکر کی ملاقات مرزا سے دوستانہ طریقہ سے ہوئی۔ اور معانقہ وعطائے عطر و پان کی نوبت آئی۔ مسٹر اینڈریو سٹرلنگ نے جن کی تعریف میں مرزا کا فارسی قصیدہ موجود ہے۔ نواب گورنر جنرل کے نام غالب کی عرضداشت لے کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اور کونسل میں پیش کیا۔ لیکن جب یہ عرضداشت گورنر جنرل کی کونسل میں پیش ہوئی تو وہاں سے حکم ہوا کہ پہلے یہ درخواست ایجنٹ دہلی کے پاس ہونی چاہیئے۔ چنانچہ مرزا خود تو کلکتہ رُکے اور اپنے وکیل ہیرالال کو دہلی لکھا کر مناسب عرضداشت پر سر ایڈورڈ کولبروک ایجنٹ دہلی کی سفارش کرا کے کلکتہ بھجوائے۔

جب کہیں مہینوں کے بعد مرزا کا خط دہلی پہونچا اور وکیل کو وکالت نامہ ملا۔ تو سر ایڈورڈ کولبروک دورہ پر چلے گئے تھے۔ اور عرضی پیش نہ ہوسکی۔ ادھر لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل شکار پر مالدہ گئے ہوئے تھے اور ان کی کونسل کے مختلف ارکان جابجا پریشان تھے۔ مرزا سے اپنے مقدمے کے متعلق تو کچھ نہ ہوسکا۔ ہاں فارسی شعرگوئی کا جو شوق طبیعت میں راسخ ہوگیا تھا۔ اُسے پورا کرنے کے موقعے ملتے رہے۔

بادِ مخالف

کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ[1] جاری کیا تھا اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قایم ہوئی تھی۔ جہاں ہر

---

[1] یہ مدرسہ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ۱۷۸۱ء میں قایم کیا۔ اس زمانہ میں شاہ ولی اللہؒ کے ایک فاضل شاگرد مولانا مجید الدین کلکتہ تشریف لائے تو شہر کے مسلمان اکابر و علمانے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مہینے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا اور اردو فارسی غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔ ان میں ایک غزل کا مقطع ہے ؎

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب
رسمِ اُمید ہمانا از جہاں برخیزد

جب ذیل کا شعر پڑھا گیا تو لوگ معترض ہوئے ؎

جزوے از عالم واز ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را نازمیاں برخیزد

اعتراض یہ تھا کہ عالم واحد ہے اور ہمہ واحد سے پہلے نہیں آسکتا (اس اعتراض کی تائید میں قتیل کے رسالوں سے حوالے دیئے گئے) اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض تھا کہ زدہ کا استعمال غلط ہے ؎

شورِ اشکے بہ فشارِ بنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدہ

(نوٹ بقیہ صفحہ) گورنر جنرل سے کہا کہ اتنے بڑے عالم کے لیے درس کا انتظام ہونا چاہیئے اور یہ فرض حاکم وقت کا ہے۔ وارن ہیسٹنگز نے جسے علوم مشرقی سے کچھ دلچسپی تھی۔ اس تجویز کو قبول کیا۔ اور مدرسہ کا آغاز ہوا۔ بعد میں اس میں بڑی تبدیلیاں اور اصلاحیں ہوتی رہیں۔ اور مسلمانان بنگال کی تعلیمی تاریخ میں اس ادارے کو ایک زمانہ میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت مدرسہ کے باہمت منتظمین اور مدرسین اپنا سارا کتب خانہ۔ فرنیچر۔ ڈھاکہ لے آئے۔ اور اب یہ مدرسہ عالیہ یہاں جاری۔

شاید "موئے میاں" پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ غالب کہتے ہیں ؎

موئے را برکمر کہ گفت غلط ؟

شعر را سر بسر کہ گفت غلط ؟

غالب کے معترضین کافی با اثر تھے۔ جن لوگوں کے اعتراضات کا انہیں خوف تھا ان میں مولوی عبدالقادر رام پوری (نواب عماد الملک بلگرامی کے دادا۔) مولوی کرم حسین بلگرامی سفیر حکومت اودھ۔ مولوی نعمت علی عظیم آبادی[۱] اور فارسی کے دوسرے مستند اُستاد تھے، لیکن مرزا بھی تنہا نہ تھے۔ انہی دنوں شاہزادہ کامران کی طرف سے کفایت خاں ایک ایرانی سفیر کلکتے آیا ہوا تھا' اس نے غالب کے اشعار کی تعریف کی اور اساتذہ کے پانچ سات شعر ایسے پڑھے' جن میں ہمہ عالم' ہمہ روز' ہمہ جا' اس طرح کی ترکیبیں موجود تھیں[۲]۔ اس کے علاوہ نواب اکبر علی خاں متولی امام باڑہ ہگلی (دبرادر زادہ مصنف سیر المتاخرین) اور دوسرے ذی علم حضرات نے مرزا کا ساتھ دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے مخالفین کی تعداد زیادہ تھی۔ موافقین کی بہت کم اور غم و غصہ سے بیقرار ہو کر انھوں نے (غالباً مشاعرے کے بعد) ایک گروہ سے تلخ طریقے سے بحث کی (اور شاید قتیل کو بُرا بھلا کہا۔ جس سے زبان آور ان

---

[۱] یہ مثنوی (باد مخالف) وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال اُدھیڑ ڈالتے۔ (عودِ ہندی صفحہ ۱۰)

[۲] عود ہندی صفحہ ۱۷۱)

کلکتہ[1] اور گرانمایگان عالم حرف[2] اور برہم ہوئے۔ مرزا اس بات کی شکایت کرتے ہوئے "کہ کسی نے اُن کا ساتھ نہ دیا" لکھتے ہیں ؎

چوں بدیدید بے گناہی من — تاں نہ شستید رُوسیاہی من
ہر کہ دیدم رہ خموشی رفت — بود لازم بر آں گرفت گرفت
از چہ بود آں بہ عرصہ دم نزدن — در رہِ آگہی قدم نزدن
نکشودن لبے بہ بیا ذریم — خیرہ بگزاشتن بجا دریم
تا بشوریدِ دل زبے جگری — بفغاں آمدم و خیرہ سری
از غم دل ستوہ گردیدم — چہرہ بایک گروہ گردیدم
گلہ مندانہ گفتگو کردم — پارۂ در سخن غلو کردم

اس سے مخالفت اور کش مکش اور بڑھ گئی۔ بلکہ شاید مرزا کے قدردانوں اور مشاعرے کے مہتممین (انجمن سازان) کو بھی ملال ہوا۔ لیکن مرزا طبعاً صلح پسند تھے اور اب بالخصوص اس غربت اور احتیاج کی حالت میں کلکتے کے بااثر لوگوں سے بگاڑ مول لینا دانشمندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد محسن کے ایما[2] پر ایک فارسی مثنوی بادِ مخالف لکھی جس میں معترضوں کے جواب استادہ

---

[1] یہ ہنگامہ کلکتہ میں ہوا تھا اس لیے "سخن پروران کلکتہ" کو خطاب کیا گیا، لیکن غالب کے بالمقابل زیادہ تر بلاد شرقی (لکھنؤ، عظیم آباد) کے بزرگ تھے۔ جو ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں کلکتے میں مقیم تھے۔ قتیل کا سکہ بھی لکھنؤ اور عظیم آباد میں زیادہ چلتا تھا۔ غالب کے متعلق ان بزرگوں کی جدید ترجمانی کے لیے ملاحظہ ہو، حیاتِ فریاد، شاد عظیم آبادی صفحات ۹۰، ۹۱ و ۱۰۲، ۱۰۳۔

[2] مولوی محمد محسن گورنر جنرل کے دفتر میں منشی تھے۔ غالب کے دلی قدردان اور

دلائل کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اراکین انجمن اور قتیل کی تعریف کرکے صلح و آشتی کی کوشش کی ہے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں مرزا نے زیادہ تر فارسی اشعار لکھے، لیکن وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعرگوئی پر بخوبی قادر تھے۔ اور اس زمانے میں بھی خاص خاص موقعوں پر اُردو شعر کہہ لیتے تھے۔ چنانچہ چکنی ڈلی کی تعریف میں اُن کا مشہور اُردو قطعہ کلکتے ہی کی ایک صحبت کی یادگار ہے۔ اور مولوی کرم حسین بلگرامی سفیر اودھ کی خاطر لکھا گیا۔

گُلِ رعنا

کلکتے میں غالب کی مُلاقات مولوی سراج الدین احمد[1] سے ہوئی۔ جن کا اخبار آئینہ اسکندر سے کچھ تعلق تھا اور جن کا حکام میں بھی رسوخ تھا۔ انہیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھنا چاہیئے اور غالب کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انہیں کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اُردو دیوان کا انتخاب اور فارسی کلام گُلِ رعنا کے نام سے جمع کیا۔ اس انتخاب کا ایک نامکمل نسخہ جس میں آخر کے اُردو اشعار اور فارسی غزلیں ہیں مولانا حسرت موہانی کے پاس تھا۔ اس میں کئی ایسے اردو اشعار درج ہیں جو بعد میں منتخب اُردو دیوان سے خارج کر دیئے گئے۔ گُلِ رعنا کا مقدمہ اور خاتمہ مرزا کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔ اور مرزا کی شاعری کے طالب علم کے لیئے بڑا دلچسپ ہے۔

کلکتہ میں غالب کا قیام دو سال سے کچھ کم نہ ہوگا۔ شروع شروع میں تو نئی نئی صورتیں اور نئے انتظامات نظر کو بہت بھائے، گورنر جنرل کی خدمت میں باریابی ہوئی خلعت ملا،

(نوٹ بقیہ صفحہ ۸۳) ...... مخلص دوست تھے، گورنر جنرل کے قیام دہلی کے دوران میں وہ غالب کے مکان پر مقیم ہوئے۔ اسکے جلد بعد بجرم "خفیہ نویسی" اپنے عہدے سے معزول ہوئے۔

[1] مولوی سراج الدین احمد بعد میں لکھنؤ آ کر مقیم ہوئے۔ (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۱۰)

اور باقاعدہ دربار کا اعزاز حاصل ہوا۔ مرزا بعد کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

.....میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید۔ یہ تین رقم خلعت ملا۔ یہ خلعت ریاست کا ہے۔ عوض خدمت نہیں۔ انعامی نہیں۔

اس کے علاوہ کلکتے میں ان دنوں نازنینانِ فرنگ کی کثرت تھی۔ ان کی گوری چٹی صورتوں اور بندرگاہ کی سرد ہواؤں، سرسبزی (اور وہاں بنگالے کے آموں) نے غالب کو مسحور کر لیا۔ واپسی کے بعد ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں۔

کلکتہ را غنیمت باید پنداشت۔ شہرستانے بدیں تازگی در گیتی کجاست ما خاک نشینی آں دیار را از ادرنگ آرائی مرز و بوم دیگر خوش تر من بخدا اگر متاہل نبودمے و طریق ناموس عیال نداشتمے۔ دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے و خود را در آں بقعہ رساندمے۔ تا زیستمے دراں مینو کدہ بودمے۔ واز رنج ہوا ہائے ناخوش آسودمے۔ زہے ہوا ہائے سرد و خوشا آبہائے گوارا و فرخا انبہ ہائے ناب و خرما ثمر ہائے پیشی رس سے

ہمہ گر میوہ فردوس بخوان تا باشد
غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد

ایک اردو قطعہ بھی انہی احساسات کا ترجمان ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ ہف نظر ۔۔۔ طاقت رُبا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

شروع شروع میں تو غالب جادوئے بنگالہ سے خوب مسحور ہوئے لیکن جب دو سال گذر گئے اور حسب منزل کو پیش نظر رکھ کر گھر سے نکلے تھے۔ وہاں تک رسائی نہ ہوئی تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی۔ چنانچہ ان کے بعد کے خطوط تلخی سے پُر ہیں۔ اور ایک فارسی قطعے میں بھی کلکتہ کے متعلق انھوں نے مکالمے کی صورت میں تلخ جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

حال کلکتہ باز جستم و گفت ۔۔۔ بایداقلیم ہشتمش گفتن

گفتم اینجا چہ شغل سود دہد؟ ۔۔۔ گفت از ہر کہ ہست ترسیدن

گفتم ایں جا چہ کار باید کرد؟ ۔۔۔ گفت قطع نظر زشعر و سخن

گفتم از بہر داد آمدہ ام

گفت بگریز و سربسنگ مزن

مقدمہ کا فیصلہ مرزا کے خطوط سے خیال ہوتا ہے کہ دہلی سے سرایڈورڈ کولبروک نے مرزا کے حق میں رپورٹ کی تھی اور کلکتہ سے بھی حوصلہ افزا جواب گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ جواب نہ پہونچا تھا کہ کولبروک معزول ہو گیا۔ اور معاملے پر نئے سرے سے تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ کلکتہ میں مرزا کا قیام کسی طرح مفید نہیں ہو رہا تھا۔ اور گورنر جنرل خود دہلی کی طرف جانے والا تھا اس لیئے مرزا ابھی کلکتے سے مرشد آباد عظیم آباد[1]۔ باندہ ہوتے ہوئے دہلی واپس گئے اور ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء کو

---

[1] متفرقات غالب صہ ۸۶۔۸۷

وہاں پہونچ کر نئے ایجنٹ فرانسس ہاکنس سے مدد چاہی۔ کرنیل ہیولاک نے مرزا کی سفارش نئے ایجنٹ سے کی تھی۔ اور انہیں کچھ امید بھی ہوئی لیکن ایجنٹ نے رپورٹ نواب شمس الدین رئیس فیروز پور کے حق میں کی۔ مرزا کو ان کے دوستوں نے اس کی اطلاع دی۔ مگر وہ مطمئن تھے کہ اینڈریو سٹرلنگ اس معاملے کو سنبھال لیگا۔ لیکن ابھی یہ رپورٹ کلکتے نہ پہنچی تھی کہ ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو اسٹرلنگ مرگیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے تقسیم جائیداد کی تائید میں لارڈ لیک کا ایک فارسی شقہ پیش کیا تھا۔ جسے مرزا جعلی بتلاتے تھے۔ اس کے مطابق نصراللہ خاں کے وارثوں کی غور و پرداخت کیلئے جو رقم مئی ۱۸۰۶ء میں مقرر ہوئی تھی۔ وہ اس حکمنامہ مورخہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ ہوگئی تھی۔ جس میں دو ہزار خواجہ حاجی کے پندرہ سو مرزا نصراللہ خاں کی ماں اور بہنوں کے اور پندرہ سو اس کے دو بھتیجوں یعنی مرزا غالب اور مرزا یوسف کے تھے۔ مرزا اس شقہ فارسی بے نام و نشان کی صحت اور اہمیت کے منکر تھے لیکن سرجان ملکم نے جن سے اس امر میں مشورہ لیا گیا۔ اسے اصلی تسلیم کیا اور اس کی بنا پر لارڈ ولیم بنٹنگ نے ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو مرزا کا دعویٰ خارج کر دیا۔

سفر کلکتہ کے اثرات

مادی نقطۂ نظر سے مرزا کا سفر کلکتہ بیکار ثابت ہوا۔ اور اقرباشی جائداد کی تمام تگ و دو رائیگاں گئی وہ تو حکومت کی بے انصافی کے شاکی تھے۔ لیکن جو شواہد موجود ہیں ان پر نظر کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ ان کی مالی قسمت کا فیصلہ اسی وقت ہوگیا تھا۔ جب وہ ابھی دس برس کے تھے۔ اور نواب احمد بخش نے لارڈ لیک سے ایک شقہ لے کر ان کی سالانہ آمدنی میں تخفیف کا فیصلہ کرالیا تھا۔ اور اس پر بعد میں عمل پیرا رہے۔

اس شقہ کی موجودگی میں مرزا کے حق میں فیصلہ ناممکن تھا۔ مرزا کا دعویٰ کمزور تھا۔ لیکن اہل الغرض مجنون۔ ان کو روپے کی جو اشد ضرورت تھی۔ اس کے زیر اثر انھوں نے سراب کو چشمۂ آب سمجھا۔ اور ایک دور دراز سفر پر آمادہ ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ان پر مصائب کا اس طرح ہجوم تھا کہ ان کے لیئے معاملات پر ٹھنڈے دل سے سوچنا ناممکن تھا۔ بلکہ قرضخواہوں کے تقاضے۔ دشمنوں کی مخالفت۔ بھائی کی دیوانگی۔ اپنی علالت ' ان سب چیزوں نے ان کے دل و دماغ کی یہ حالت کردی تھی۔ کہ سفر وسیلۃ الظفر کے علاوہ دہلی کو خیرباد کہنے میں ہی انھیں نجات کی صورت نظر آئی۔ ان پر مصیبتوں کا پہاڑ یکبارگی ٹوٹا تھا۔ اور ہجوم مصائب سے شکستہ دل ہوکر اُن کا ارادہ ترکِ وطن کا تھا۔ ایک اہم خط میں میر اعظم علی کو لکھتے ہیں :-

"ہنگامۂ دیوانگی برادر یکطرف و غوغائے وام خواہاں یکسو۔ آشوبے بدید آمد کہ نفس را بر لب نگاہ۔ و زنہ چشم فراموش کرد۔ و گیتی بدیں زشتی روشناں درنظر تیرہ و تار شد۔ باہلے از سخن دوختہ و چشمے از خویش فروبستہ جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی باخود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بدم تیغ ملال بہ کلکتہ رسیدم۔ فرماندہان سر نیرنگی و کوچک دلی کردند دل رانیز و نخشیدند۔ آنہما بخشائش کہ مشاہدہ رفت امید کشائش آورد و ذوق آوارگی و ہوائے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود بدل نماند۔ ہوس آتشکدۂ ہائے یزد و میخانہائے شیراز کہ دل رابسوئے خود میکشید و مرا بہ پارس می خواند از ضمیر بدر جست "

کلکتہ کے سفر اور آشوب گاہ دہلی سے دوری نے غالب کی طبیعت میں

سکون و توازن پیدا کر دیا۔ اور انھوں نے ہمت اور حکمت آموزی سے اپنے آپ[1] کو سنبھالا۔ اسٹرلنگ اور دوسرے صاحبِ تقرر حکام اور مولوی ۔۔۔ الدین احمد جیسے مخلص دوستوں نے اُن کی جس طرح قدر و منزلت کی۔ اُس ۔۔ نے اُن کی خود اعتمادی بڑھا دی۔ انہیں درباری درجہ ملنے کا جو فیصلہ ہوا۔ اُس نے بھی زخموں پر مرہم کا کام دیا۔

وقتی اور ضمنی فوائد کے علاوہ سفرِ کلکتہ کا اصل فائدہ یہ ہوا کہ اس نے اُن کا تجربہ وسیع اور دماغی اُفق بلند کر دیا۔ ایک تو غربت میں طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے وہ ہوا۔ اور دہلی سے یہ دور دراز سفر، جو کہیں کشتی سے کہیں گاڑی سے اور کہیں ٹٹو پر طے ہوا۔ اُن زمانے میں ایک مہم کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کا کامیاب تجربہ ایک آرام طلب امیرزادے کی دنیا میں ایک نئی چیز تھا۔ اس کے علاوہ کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر حکومت تھا۔ ہندوستان میں تمام مغربی ترقیاں اور ایجادیں سب سے پہلے وہاں نظر کے سامنے آتیں۔ مرزا کو انہیں بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس معاملہ میں ان کی معلومات شمالی ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے زیادہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ریل۔ دُخانی جہاز۔ تار برقی۔ بجلی اور دوسری جدید ایجادات کا آئین اکبری پر تبصرہ کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ انہیں دیکھنے کا اس وقت تک اُن کے تھوڑے ہموطنوں کو موقع ملا ہوگا۔

---

[1] اس ذہنی کشمکش کی ادبی یادگار مثنوی رنگ و بو ہے۔

کلکتہ نہ صرف ہندوستان میں مغربی مادی اثرات کا منبع اور مغربی ایجادات کی تماشہ گاہ تھا۔ بلکہ وہ جدید علوم کا مرکز اور فی الواقع ایک نئی علمی چہل پہل کی آماجگاہ تھا۔

وارن ہیسٹنگز اور دوسرے انگریز حکام نے جو علمی سلسلہ شروع کیا تھا اس میں ہندو اور اسلامی طریقِ تعلیم اور مشرقی اور مغربی علوم کے لئے جگہ تھی۔ ہمارے ترجمان تو اپنے جبّے اور عمامے سنبھالتے رہے۔ ان کے لئے ذاتی تفاخر اور ذاتی پندار کی تسکین ہر چیز سے مقدم تھی۔ "ہمہ" اور "زدہ" کی بحثوں سے علمی مجلسیں میدان کارزار بنی ہوئی تھیں۔ لیکن بنگالی ہندوؤں نے ایک نئی زبان اور ایک نئے ادب کی تعمیر کر کے قوم کی نشاۃ ثانیہ کا سامان کر دیا۔ غالبؔ بھی وضعداروں کے وضعدار تھے، آبائی پیشہ سپہبدی تھا۔ وہ مناظروں اور مجادلوں سے اپنے آپ کو کیسے بچاتے، ان کا بھی کافی وقت علم و انا کی نمائش گاہوں میں تلف ہوا۔ اس کے علاوہ وہ نہ انگریزی جانتے تھے، نہ بنگالی۔ نئی تحریک سے پوری طرح مستفید ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن خدا نے انہیں ذہن رسا اور طبع اخاذ عطا کی تھی کلکتہ کی فضا سے وہ غیر متاثر نہ رہ سکتے تھے۔ کلکتہ میں مشرقی علوم کی حسب طرح نئی تدوین ہو رہی تھی۔ وہاں جو چیدہ چیدہ عالم اور اہلِ قلم جمع تھے، یقین ہے، اُن سے مرزا نے کسبِ فیض کیا ہوگا۔ اس زمانے میں کئی انگریز فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور فارسی بولنے پر قادر تھے، غالبؔ کی ان کے ساتھ گفت و شنید ہوتی ہوگی۔ ایک عالم بذلہ سنج رئیس زادہ کی حیثیت سے ان پر سب دروازے کھلے ہوں گے۔ غالبؔ کی اخبار بینی کی بسم اللہ کلکتے میں ہوئی۔ اور پھر یہ شوق انہیں تمام عمر رہا۔

ان کے خطوط میں کئی اخباروں کے نام آتے ہیں، مثلاً آئینۂ اسکندر جو ایک ادبی قسم کا پرچہ تھا اور جس سے مرزا کے محبِ خاص مولوی سراج الدین احمد کو دلچسپی تھی۔ جامِ جہاں نما۔ آئینۂ گیتی نما۔ اُن سب کے نام غالب کے فارسی خطوط میں آتے ہیں قیامِ کلکتہ کے دوران میں نہ صرف غالب کو یہ اخبار دیکھنے کا موقع ملا۔ بلکہ ان لوگوں سے شناسائی ہوئی جو یہ اخبار نکالتے تھے۔ یا جن کی خبریں ان میں چھپا کرتی تھیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اخبار بینی کا شوق راسخ ہوگیا۔ اس کی بدولت مرزا کی واقفیت میں جو اضافہ ہوا، اور افقِ معلومات میں جو وسعت ہوئی اس کی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کریں کہ اس وقت دہلی اور باقی شمالی ہند میں کوئی اخبار نہ تھا۔ بلکہ برسوں بعد تک کوئی مطبع نہ تھا۔ اور عام شعراء اور اہلِ قلم کو معلومات کے یہ ذرائع حاصل نہ تھے۔

غالب کے مزاج میں جو جدید منشی (Modrenity) ہے۔ انہیں اپنے دہلوی ہمعصروں پر معلومات اور اندازِ خیال کے لحاظ سے جو فوقیت حاصل ہے ان کے اور اپنے درمیان ہم جو اتنی چیزیں مشترک پاتے ہیں۔ ان کا راز مرزا کی جدت پسندی اور قابلیت کے علاوہ کلکتہ کے اثرات میں ڈھونڈھنا چاہیئے۔

اس کے علاوہ غالب کے کلام میں ایک اور عنصر ہے جس کا سراغ شاید قیامِ کلکتہ کے اثرات میں ملے، یہ ہے اُن کی خرد پسندی۔ اور عقل سمجھ کی اہمیت پر زور۔ یوں تو ہر سمجھدار انسان عقل سمجھ کی فوقیت تسلیم کرتا ہے، لیکن جس کثرت سے مرزا نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اور مختلف طریقوں سے اسے واضح کیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید عقل سمجھ کی برتری ان کے لیئے ایک مرکزی عقیدہ کی

حیثیت رکھتی تھی۔ اور شاید اس طریق کار کا اس ریشنلزم اور مغربی فلسفہ سے کچھ تعلق ہو، جو کلکتے کے راستے انگلستان سے آرہا تھا۔ غالب نے نثر اور نظم میں ہر جگہ "دید و دانش" کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اور اسے اپنی پشت پناہ بنایا ہے مثنوی ابر گہربار میں ایک مستقل باب خرد کے متعلق ہے اور اسے ہر چیز پر فوقیت دی ہے۔ مرزا کی آزاد خیالی کی اساس بھی عقل کی فیصلہ کن قوت ہے (مرا نیز خرد سے در روانی داده اند فراز آوردهٔ اندیشهٔ بیگانگان را جز به پذیرم و از نیروے خرد خدا داد کار چرا نگیرم)، مرزا کے جاننے والے مثلاً میر مہدی ان کی عقل و خردمندی کی خاص طور پر تعریف کرتے ہیں۔ غالب کے کلام اور ان کی شخصیت میں عقل و خرد کی اتنی غیر معمولی اہمیت ہے۔ کہ اس کا خارجی سراغ ڈھونڈنا بیجا نہیں۔ اور یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس طریق کار کا بیج ہرمزد کی صحبت میں بویا گیا۔ بیدل کے فیض سے پھلا پھولا۔ اور کلکتے کی سازگار ہوا میں یہ ننھا پودا ایک تنومند درخت بنا۔

جب مرزا کلکتہ میں تھے، اس وقت وہاں سب سے بڑی علمی شخصیت راجہ رام موہن رائے کی تھی۔ مرزا ان سے ناواقف نہ تھے، اگرچہ بدقسمتی سے ان کے قریبی تعلقات مرزا کے مخالف فریق سے تھے۔ راجہ رام موہن رائے اسی زمانہ میں بادشاہ دہلی کی طرف سے سفیر ہو کر انگلستان گئے۔ اور اس وقت کلکتہ میں بادشاہ کے سفیر مرزا افضل بیگ تھے۔ جو خواجہ حاجی کے برادر نسبتی اور جائداد کے مقدمہ میں مرزا کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ جب راجہ رام موہن رائے کے متعلق خبر گرم ہوئی کہ وہ گورنر جنرل کی پرائیویٹ کونسل کے رکن بن گئے ہیں تو غالب کو بڑی فکر لاحق ہوئی:۔

"از جملہ اخبار وحشت انگیز یکے این است کہ بعض ثقات میگویند کہ جناب نواب گورنر بہادر پریویٹ کونسلے قرار دادہ اند و رام موہن رائے یکے از اجزائے آں کونسل است۔ اگر چنیں است برحال خود ما خوں باید گریست"

راجہ رام موہن رائے کے متعلق غالب کے اندیشے صحیح ہوں یا غلط لیکن وہ ان سے پوری طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ابوالقاسم خاں کے نام کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بعد میں مرزا افضل بیگ اپنے خواہر زادوں کی خاطر غالب کا سخت مخالف ہوگیا۔ لیکن شروع میں اس کا غالب کے ساتھ "آشتی کا رشتہ بلکہ "پیمانِ یاری" تھا (متفرقات غالب صفحہ ۹۴) غالب کے ہاں اس کا آنا جانا تھا۔ مولوی سراج الدین کے نام کے ایک خط میں مرزا افضل بیگ کے مرزا کے ہاں اس زمانے میں آنے کا ذکر ملتا ہے۔ جب مقدمہ کی کش مکش عروج پر تھی (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۳۱) کلکتے میں بھی ان کے مابین آمد و رفت اور ملاقات تھی (کلیات صفحہ ۹۹) عجب نہیں کہ غالب نے راجہ رام موہن رائے کو کبھی مرزا افضل بیگ کے مکان پر ہی دیکھا ہو۔ یہ تو قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ اس کے کاموں، اس کی فارسی تصانیف مثلاً تحفۃ الموحدین۔ اس کے فارسی اخبار (مرآۃ الاخبار) سے ناواقف ہوں اور اس اصلاحی/لبرل تحریک سے بے خبر ہوں، جس کی وہ راہنمائی کر رہا تھا۔

سفرِ کلکتہ کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ اس دوران میں غالب کو دیر تک لکھنؤ میں قیام کرنے اور "تازہ خیالانِ لکھنؤ" کی ادبی سرگرمیوں سے بالمشافہ باخبر ہونے کا موقع ملا۔ لکھنؤ اس وقت اپنے عروج پر تھا اور اردو زبان کی

کے تہذیبی اداروں کا رجحان وضعداری کی طرف تھا۔ سرسید کی جدید تحریک کی سب سے زیادہ مخالفت پہلے کانپور کے سب جج علی بخش خاں اور پھر اکبر (الہ آبادی) شبلی (اعظم گڑھی) اور حسرت (موہانی) نے کی۔ اودھ سے مشرق کی طرف چلیں۔ اور عظیم آباد، مرشد آباد کلکتہ۔ جہانگیر آباد (ڈھاکہ) پہنچیں تو نظر آتا ہے کہ قدیم تہذیب و تمدن اور اسلوبِ کار کو برقرار رکھنے کی کوششیں یہاں زیادہ زوروں پر تھیں۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے جس طرح غالب کے سفرِ کلکتہ کے سو سال بعد تک جدید تعلیم کی کامیاب مخالفت کی۔ اور ڈھاکہ کے نواب سید محمد آزاد نے جس طرح سرسید کی اصلاحی تحریک کی مخالفت میں اکبرالہ آبادی کے سوا اودھ پنچ کے باقی سب مضمون نگاروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس سے انیسویں صدی میں بلادِ شرقی کے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کو اس کا ذاتی تجربہ تھا۔ انھوں نے مدرسہ کے مشاعروں میں دیکھا تھا کہ کس طرح ترقیوں اور (مستعار) ایجادوں کے اس شہر میں قتیل کے رسالوں کے حوالے اور سندیں طلب کی جاتی ہیں۔ اسی لئے تو انھوں نے یہ کہہ کر نالا س

زلّہ بردارِ کس چرا باشم　　　من ہمائم، مگس چرا باشم

لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا کہ جب آخیر عمر میں غالب نے پرانے لغت نویسوں پر نکتہ چینی کی اور اس فن میں نئی راہیں نکالنی چاہیں تو پرانوں کی حمایت میں سب سے مبسوط کتاب کلکتہ سے شائع ہوئی۔ آغا احمد علی جہانگیرنگری کی لکھی ہوئی۔

عام تہذیبی رجحانات سے قطع نظر، کلکتہ کے جن وضعدار ادبی حلقوں میں غالب

ادب اور اردو زبان کے لیئے تھی، شاہانِ اودھ کے دربار میں فارسی کو فروغ نہ تھا، لیکن شیعی مذہبی حلقوں میں بڑے جید عالم اور فارسی زبان کی باریکیاں اور ادبی خوبیاں سمجھنے والے کئی تھے۔ غالب کو ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہ آغا میر کے طریق کار اور لکھنؤ کی عام انتظامی حالت کے شاکی تھے۔ لیکن لکھنؤ میں جو تعلقات انھوں نے قائم کیئے، وہ بعد میں مادی طور پر بھی نیک پھل لائے، اور ناسخ کے ادبی اثرات کا بھی انھوں نے اعتراف کیا ہے (جازۂ خضر)

مرزا غالب کے سفر کلکتہ نے ان کی ہوش و خرد اور معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ذہنی اُفق کو وُسعت اور بلندی دی۔ ان کی خیال پرستی اس سے پہلے ہی حقیقت پسندی میں تبدیل ہورہی تھی۔ سفر کلکتہ سے اس عمل کو تقویت ملی، لیکن جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ غالب کا آسان اندازِ مکتوب نویسی سفر کلکتہ کا رہ آورد ہے یا اس سفر سے غالب کے ذہن میں ایک جدید ادبی تحریک کا آغاز ہوا، ان سے ہم متفق نہیں۔ آسان مکتوب نویسی کی نسبت ہم بتا چکے ہیں کہ جہاں تک اصول و نظریہ کا تعلق تھا۔ غالب سفر کلکتہ سے کئی سال پہلے اس کی حمایت کر چکے تھے اور جہاں تک اس اصول پر عمل کا سوال تھا غالب نے سفر کلکتہ کے بعد بھی اسے پچیس سال تک اختیار نہ کیا۔ اس کے علاوہ ہمارا خیال ہے، کہ خالص ادبی معاملات میں سفر کلکتہ کے اثرات تبدیلی اور اصلاح کے حق میں نہ تھے۔ کلکتہ میں نووارد انگریز ملازمین کی سہولت کے لیئے فورٹ ولیم کالج نئی نثر کا مرکز بن گیا تھا۔ لیکن غالب کی تحریروں میں اس کالج، وہاں کی مطبوعات یا اساتذہ کی نسبت ہمیں کوئی اندراج نہیں ملا۔ مرزا کے سفر کلکتہ سے

کی زیادہ آمد و رفت تھی اور جن جاگیرداروں سے انہیں سابقہ پڑتا تھا، ان کے اثر سے ایک نئی ادبی تحریک کا آغاز ناممکن تھا۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ سفر کلکتہ کا ایک ادبی نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی سے مرزا کا شغف بڑھ گیا۔ سفر کلکتہ سے پہلے انھوں نے اردو اشعار زیادہ لکھے، فارسی اشعار کم۔ بلکہ قیام کلکتہ کے دوران میں بھی جب انہیں ایک مرتبہ فی البدیہہ شعر کہنے پڑے تو انہوں نے اردو قطعہ ہی پیش کیا، لیکن مرزا نے کلکتہ میں فارسی کی جو بہار اور قدر و منزلت دیکھی اس نے ترازو کا پلہ اس زبان کی طرف جھکا دیا۔ اور اب انھوں نے اُردو شعر گوئی بیک قلم ترک کردی۔ فارسی زبان میں بھی روایتی انداز بیان ملحوظ رکھا۔ ان کی شاعری میں رنگ بیدل نکھر رہا تھا۔ لیکن اب وہ سہ نثر ظہوری کے چکر میں ایسے پڑے کہ عمر بھر اس سے نجات نہ ملی۔ اور جب تک قوٰی نے جواب نہ دے دیا وہ اسی طرز نگارش کو نباہتے رہے۔

ویسے سفر کلکتہ کا ایک ادبی فائدہ یہ ہوا کہ اب مرزا نے اپنی نظم و نثر کی زیادہ اہمیت محسوس کی۔ اس کی بدولت کش مکشیں ہوئیں لیکن قدردانوں کی بھی کمی نہ تھی بلکہ شاید اس وقت دہلی میں مرزا کو وہ ادبی حیثیت حاصل نہ تھی جو انہیں کلکتہ میں بعض با اثر اہل نظر حضرات (مثلاً نواب مرزا علی اکبر خاں۔ مولوی محمد محسن۔ قاضی القضاۃ ولایت حسین خاں، کفایت خاں سفیر والئ ہرات۔ مولوی سراج الدین احمد) کی بدولت ملی۔ ان کی شاعری جاگیر کی تنگ حدود میں بھی مفید ہوتی نظر آتی تھی۔ اب انھوں نے پہلی مرتبہ اپنی نظم و نثر کا انتخاب (گل رعنا) ایک باقاعدہ مقدمہ اور خاتمہ کے ساتھ ترتیب دیا۔ اور اس مسند شعر و ادب کی طرف قدم بڑھایا۔ جو قدرت نے ان کے لیے آراستہ کی تھی۔

قید خانہ نشینی

مقدمے کے بگڑ جانے سے غالب کی جو حالت ہوئی، اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔[1] مرزا کو ایک تو اتنی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا، دوسرے اہالیانِ دہلی کے طعنے جن سے بچنے کے لیے انہیں شروع شروع میں کنجِ عزلت میں پناہ لینی پڑی، ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکرِ شعر کے ناقابل تھی، لیکن آہستہ آہستہ اس زخم کا اندمال ہونا شروع ہوا۔ ان کے عزیز دوستوں میں سے ان کے تعلقات مولوی فضلِ حق سے ہمیشہ برقرار رہے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں سے رابطہ اسی زمانے میں بڑھا۔ اور نواب امین الدین اور ضیاء الدین سے جو نواب شمس الدین سے خوش نہ تھے رشتہ اخوت اور مضبوط ہوگیا۔

---

[1] مرزا ایک خط میں مولوی سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں: "کارِ من بداں گاہ دہلی چنانکہ بایستہ باشد تباہی گزید۔ حالیا بر آں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد، با زہداں در رسم و دندہ دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا از خود دیگر بانم۔" لیکن مرزا غم کی باگ کو بہت ڈھیلی نہ چھوڑتے تھے۔ (شاید بھائی کی علالت کے بعد انہیں اس احتیاط کی ضرورت خاص طور پر محسوس ہوتی ہوگی اور ممکن ہے بیدل کے حکیمانہ اثرات کو بھی اس میں کچھ دخل ہو) وہ ایک اور خط میں سراج الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔ (اور اس فلسفہ تسلیم و رضا کا سبق دیتے ہیں، جو آگے چل کر ان کا ملجا و ماوی بننے والا تھا) "شکوہ پایاں نداشت و گلہ کراں پذیر نبود۔ رفتم و بروزگار ساختم ..... ہرچند وقوع ایں امرِ مکروہ مستوجب ہزار گونہ اندوہ و ملال است، اما بخدا کہ دل آزادہ من بہ ہیچ سو مایل نیست۔ و از عدم حصولِ مقصود نرنجیدہ ام ......" (اگلے صفحہ پر)

مرزا کے عزیز دوست کئی تھے۔ لیکن ان کے باوجود ان کے مصائب کم نہ ہوئے اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ نواب شمس الدین کا دلی میں بڑا رسوخ تھا۔ دوسرے مرزا کا قرضہ جو کلکتے جانے سے پہلے ہی انہیں پریشان کر رہا تھا۔ بہت بڑھ گیا تھا۔ اور چونکہ قرضخواہوں کو اب کوئی بڑی جائیداد نظر نہ آتی تھی۔ وہ قرضے کی وصولی کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ ان میں سے دو نے دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی۔ مرزا[1] کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ ان میں زر ڈگری ادا کرنے کی طاقت نہ تھی اور قاعدے کے مطابق انہیں جیل جانا تھا لیکن چونکہ بقول اُن کے مشہور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی کہ عدالت کا چپراسی ان کے گھر نہ جاتا اور جب تک مدیون رستے میں نہ ملے اُسے قید نہ کرتے مرزا بھی گھر بیٹھے رہے، انھوں نے ایک اہم فارسی خط میں ناسخ کو اس زمانے کے حالات لکھے ہیں :۔

"چار ماہ است کہ نامہ نگار بہ کنجے نشستہ در آمد شد بروئے خویش و بیگانہ بستہ۔ اگر بزنداں اندر نیم اما خورد و خفتِ من بزندانیاں ماند۔ آنچہ درین چند روز از رنج و آشوب دیدہ ام کافر باشم اگر ہیچ کافر بصد سالہ عقوبت جہنم از آں تواند دید"

بقیہ نوٹ صفحہ ۹۷ :۔ خدا ئے را کہ نامرادی و ناکامی برمن آسان است۔ اما برخے از خندہ عدا و ملامتِ خوامی آزار میکشم و آنہم می گذرد ؎

در طعنہ گر امروز ز موسیٰ اثرے نیست فرد است کہ از طور رہم آثار نماند

[1] مرزا کا قرض چالیس ہزار سے زیادہ اور پچاس ہزار سے کم تھا۔ لیکن ابھی ان کے خلاف فقط پانچ ہزار کی ڈگری ہوئی تھی۔ (متفرقات غالب صفحہ ۱۰۱)

مرزا کی عارضی گرفتاری کے متعلق ملاحظہ ہو۔ ذکر نوٹ صفحہ ۱۲۳

فریزر کا قتل

مرزا اس "قید خانہ نشینی" میں تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کو ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ فریزر سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے[1] اور انہیں امید تھی کہ شاید اس کی اعانت سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے۔ فریزر کی تعریف میں ان کا ایک پُر زور قصیدہ ہے ؎

زجیبِ افق مرچوں سر بر آورد | مے از سبز مینا بساغر بر آورد
من و بزم ولیم فریزر بہادر | کہ از جیب ہر گوشہ گوہر بر آرد
خہے دادگسترکہ گر در حضورش | خسے داد از دست آذر بر آرد
کشد انتقام خس از شعلہ چنداں | کہ دود از نہادِ ہر اخگر بر آرد

مرزا کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا، چنانچہ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں:۔

"یکے از ستمگرانِ خدا ناترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد، ولیم فریزر صاحب بہادر را کہ ریذیڈنٹ دہلی و غالبِ مغلوب را مُربّی بود۔ در شب تاریک بضربِ تفنگ کشت و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد۔"

ان دنوں جو صاحب دہلی میں مجسٹریٹ تھے۔ وہ غالب کو جانتے تھے انھوں نے دوسروں کے علاوہ غالب سے بھی تفتیش جرم کے سلسلے میں مدد لی۔ اور سرکاری تفتیشات کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین اور اس کا ایک سپاہی مجرم قرار دیئے گئے۔ نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ہی تھے، دہلی کے لوگ لے اُڑے کہ نواب بے گناہ ہے

---

[1] عبدالرحیم دہری گورکھپوری اپنی غیر مطبوعہ خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ ولیم فریزر کے پاس عربی اور فارسی کتب کا بڑا ذخیرہ تھا جس سے اس نے استفادہ کیا اور حیات الحیوان، تاریخ الحکماء، خمسہ نظامی، دیوان مسعود سعد سلمان وغیرہ مستعار لیکر پڑھیں عجب نہیں کہ غالب اور فریزر کے تعلقات کا بھی ایک علمی پہلو ہو۔

اور غالب اور فتح اللہ بیگ خاں نے کینہ وری سے حکام کو اس کے خلاف بھڑکا رکھا ہے۔

نواب شمس الدین سے جنہیں مسٹر کالون کی مزید تحقیقات کے بعد سوم اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری بازار کے باہر شارع عام میں پھانسی دی گئی۔ عوام کو بہت ہمدردی تھی۔ نواب کی بے گناہی کا خیال تو غلط تھا، اور حکام کو اصل سراغ مرزا فتح اللہ بیگ سے ملا۔ لیکن غالب کے متعلق اگرچہ عوام کا خیال بے بنیاد ہی ہو، تاہم یہ خیال عام ہونے کے بعد ان کا غالب سے جو برتاؤ ہوگا۔ وہ ظاہر ہے اور مرزا نے ناسخ کے نام اس زمانے میں جو دو خط لکھے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لیئے یہ وقت کس ابتلاء اور آزمائش کا تھا۔ اور وہ غصے اور عداوت سے کس طرح بے قابو ہو رہے تھے۔ اس وقت ان کا ایک قدیمی دشمن امارت و ریاست کی سربلندی سے ہلاکت و تباہی کے غار میں گر رہا تھا۔ اور غالب کے بیان سے حریفانہ خوشی و طمانیت نمایاں ہے۔ وہ ناسخ کو مجسٹریٹ کے ساتھ "پژوہشِ کار" میں ہمراز ہونے اور شہر والوں کی بدگمانیوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"کار بجائے رسیدہ کہ آفرین بر درد یادہ سرایان دہلی گردیدہ۔ ہر چند در آغاز ہمہ آں بود کہ دل از غم مرگ نسیم فریزر بہادر مے سوخت۔ اکنوں ہم قاتل مشخص شد، وہم بدگمانانِ شہر مرا ستودہ آوردند۔ از ایزدِ ستمگر کش ستم رسیدہ نواز بدعاہائے صبح گاہی مے خواہم کہ ایں خیرہ سر بے آزرم زودتر بیاد افراہ گرفتار و از سر فرازی بہ پایۂ دار آید۔ و دانم کہ ہمتم ظفر یاب و دعایم مستجاب است۔"

بعض لوگوں کو غالب کے قلم سے ان خیالات کا اظہار عجیب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن انہیں پڑھتے وقت جس فضا میں بیٹھ کر مرزا نے یہ الفاظ لکھے تھے۔ اس کا اور مرزا اور نواب کی شدید دیرینہ عداوت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مرزا کو نواب کے جرم کا بھی پورا یقین تھا۔ نواب شمس الدین کے مداح یہ دعوے نہیں کرتے کہ فریزر کے قتل میں اس کا ہاتھ نہ تھا۔ اور فریزر سے اس کی عداوت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فریزر نواب امین الدین اور مرزا ضیاء الدین (اور شاید غالب) کو ان کا حق دلانا چاہتا تھا۔ قدرتی بات تھی۔ کہ ان تینوں کو فریزر کے قتل کا رنج ہوتا۔ مرزا نے ناسخ کو دوسرا خط اُس وقت لکھا۔ جب نواب کو پھانسی دی جا چکی تھی:۔

"ہمت بکارِ شگرف آویختہ بود۔ نظر منظرِ بلند را دیدبانی ہمے کرد تا آنکہ ہنگام سر آمد۔ دہر کردار کیفرے کہ بایست یافت۔ مرزبانِ میوات مانند کریم خان سرہنگِ خویش بحلق آویختہ شد۔ سراثرش بہ عدم آباد رفت۔ مصرع۔

ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت"

نواب کی وفات کے بعد فیروز پور جھرکہ کی ریاست ضبط ہو گئی، اور مرزا کی پنشن جو انہیں اس ریاست سے ملتی تھی، دہلی کلکٹری سے ماہوار ملنی شروع ہوئی۔ مرزا نے اس موقع پر پھر ایک مفصل عرضی گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں نواب کی جائداد سے پورا حق پانے کے لیئے پیش کی، اسی خط میں ناسخ کو لکھتے ہیں "ہنوز امنتظر ان آثار یاوری بختم۔ صاف تر کہ اینکہ آنچہ جاگیر داد فیروز پور بمن میداد۔ از حقدار بایست کمتر بود وبداں قدر از سرِ کار قانع نیستم۔ بالجملہ سخنے ایست پیچ در پیچ و کاریست گرہ در گرہ، آنچہ بہ پیدائی خواہد رسید، نگاشتہ خواہد شد"

لیکن لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کے حقوق کا قطعی فیصلہ کر دیا تھا۔ اس لیئے مرزا کی درخواست داخل دفتر ہوئی' اس پر مرزا نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے حکومت ہند کے فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا۔ لیکن مرزا کو اس عرضداشت کا جواب بھی نہ ملا۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں ایک عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں ارسال کی۔ لیکن یہ سب سعی بے سود ثابت ہوئی اور مرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن کبھی نہیں ملی۔

بہارِ سخن

غالب کی مالی مہم ناکام رہی اور جاگیر میں اضافہ کے لیئے انھوں نے جو تگ و دو کی۔ وہ انہیں منزلِ مقصود تک نہ پہونچا سکی۔ لیکن زندگی کے لق و دق صحرا میں ایک نخلستان ایسا تھا جس کے لیئے وہ غیروں کے محتاج نہ تھے اور جب انہیں مادی ناکامیاں ستاتیں تو وہ اس ہرے بھرے نخلستان کی سیر سے دل و دماغ کو تسکین دیتے۔ یہ نخلستان شعر و سخن کا سدا بہار باغ تھا، ایک ابتدائی قصیدے کا شعر ہے ؎

از بسکہ بیہ مست مے جنبش کلکم ۔۔۔ در پردۂ ہر نقشِ دلم میرود از جا

اپنے جیسے ترکیب بند میں کہتے ہیں ؎

از صریرِ قلمِ خویش بود مستیٔ من ۔۔۔ اندریں بندِ گراں ہیں و سبکدستیٔ من

گاہے گاہے مرزا کی بدقسمتی سے اس باغ میں بھی گرم ہوا کے جھونکے آئے اور شاعری کے میدان میں بھی مرزا کو مایوسیوں اور کش مکش سے واسطہ پڑا۔ لیکن یہ مایوسیاں عارضی تھیں۔ اور جب شاعر، دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر تخلیقِ نغمہ میں مستغرق ہوتا تو مادی زندگی کی تلخیاں یک قلم فراموش ہو جاتیں

ادبی سرگرمیاں

فریزر کے قتل سے چند مہینے پہلے مرزا نے دربار شاہی میں راہ پانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان کی سب تدبیریں اُلٹی پڑ رہی تھیں۔ یہ کوشش بھی چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ اس زمانے میں تخت شاہی پر اکبر شاہ ثانی متمکن تھے اور ظفر ولی عہد تھا۔ لیکن ظفر کی دماغی اور طبعی حالت بہت اچھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے بادشاہ نے ۱۸۳۴ء میں کوشش کی، کہ کسی طرح بجائے ظفر کے شاہزادہ سلیم ولی عہد تسلیم ہو جائے۔ مرزا غالب سمجھتے تھے کہ ظفر تو ذوق کا ہو رہا۔ اگر شہزادہ سلیم آگے چل کر بادشاہ ہوا تو میرے لیے بہت رہے گا۔ چنانچہ اسی سال عیدالبقر کے موقعے پر انھوں نے "شہ و شاہزادہ" کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں بادشاہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ ذیل کا مطلع ثانی لکھ کر شہزادہ سلیم کی "مناسبت طبع" کی تعریف کی تھی ؎

زہے مناسبتِ طبع شاہزادہ سلیم
بہ فیضِ تربیتِ پادشاہِ ہفت اقلیم

لیکن بادشاہ کی تجویز کو حکام انگریزی نے نہ مانا اور ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کی وفات پر ظفر بادشاہ ہو گیا۔ ممکن ہے کہ اس کے دل میں اس قصیدے کا کچھ ملال رہا ہو اور اس کی تعریف کے ابتدائی فارسی قصائد میں غالب کو بار بار معذرت کرنے کی جو ضرورت پیش آئی۔ اس کا قصیدے سے بھی کچھ تعلق ہو۔

جس سال بہادر شاہ تخت نشین ہوا، اُسی سال نصیر الدین شاہِ اودھ کا انتقال ہوا۔ اور امجد علی شاہ اس کا جانشین ہوا۔ مرزا نے اس کی تعریف

میں ایک قصیدہ لکھا۔ لیکن وہ غالباً پڑھا نہیں گیا۔ اس قصیدے میں تشبیب اور مدح کے بعد اپنی قسمت کا رونا رویا ہے ؎

با من کہ تاب نازِ نکویاں نداشتم | بد کرد یدکہ جور و جفا کرد روزگار

ایک قطعہ بند بھی ہے جس کا مضمون اقبالؔ کی مشہور نظم "اسیری" سے جو انھوں نے مولانا محمد علی کی رہائی پر لکھی تھی۔ ملتا جلتا ہے ؎

گفتم بہ عقلِ کُل کہ ندانم برائے من | حکمِ دوامِ حبس چرا کرد روزگار
گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نہ | کا ترا اگرفت و باز رہا کرد روزگار
تو بلبلی! ہمیں کہ بدام آمدی ترا | اندر قفس زبہرِ نوا کرد روزگار

بیشک غالبؔ کے لیے یہ حصۂ زندگی مصیبتوں اور ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بنجر نہ تھا، بلکہ جب مرزا کی نوابی اور جاگیرداری کے خواب پریشان ہوگئے، تو انہیں شعر و سخن سے جو ازلی دلچسپی تھی وہ اور بھی بڑھ گئی۔ اور جو چیز پہلے فقط دل لگی کا اظہار تھی۔ اب سرمایۂ حیات ہوگئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تصانیف میں زیادہ دلچسپی لے کر منتخب اردو دیوان اور فارسی نظم و نثر کو مرتب کیا۔ اور فارسی غزلیات کا معتدبہ حصہ بھی اسی زمانے میں لکھا گیا۔

پنج آہنگ جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین کی پھانسی کے کچھ دیر بعد مرزا کے نسبتی بھائی مرزا علی بخش خاںؔ[1] ان کے ہاں آکر مقیم

---

[1] ان کا غالبؔ سے دہرا رشتہ تھا۔ ان کی ہمشیرہ غالبؔ سے بیاہی تھیں اور ان کی اپنی بیوی غالبؔ کی سگی بھانجی تھیں۔

ہوئے تو ان دنوں مرزا کی فارسی نظم و نثر کا مجموعہ مرتب ہو چکا تھا۔ ابتدا میں جب غالبؔ نے یہ مجموعہ مرتب کیا تو اس میں اشعار کے ساتھ فارسی نثر شامل تھی مرزا علی بخش کو نثر جُداگانہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے میخانۂ آرزو[1] میں جو نثر موجود تھی اس کے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کرکے پنج آہنگ مرتب کی۔ اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا اپنا دیباچہ ہے جس میں یہ تفصیلات درج ہیں۔ آہنگِ اوّل میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں جو غالبؔ نے سفرِ بھرتپور کے دوران میں لکھی تھیں۔ آہنگِ دوم میں فارسی مصادر اور مصطلحات ہیں، آہنگِ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعر انتخاب کیے ہیں۔ اور خطوط نویسی میں ان کا محلِ استعمال بتایا ہے۔ آہنگِ چہارم میں تقاریظ کتب اور متفرق مضامین اور آہنگِ پنجم میں مرزا کے فارسی خطوط ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی اور ۱۸۴۸ء کے قریب یہ کتاب مکمل ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۳ء میں چھپی اس کے بعد آہنگِ چہارم اور آہنگِ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن مرزا کے کئی خطوط غدر

---

[1] پنج آہنگ کی اصل عبارت ہے "دیوانِ فیض عنوان کہ مسمیٰ بہ میخانۂ آرزو سرانجام ست" اس سے خیال ہوتا ہے کہ دیوان کا نام میخانۂ آرزو سرانجام تھا۔ لیکن اس سے یہ نام بہت طویل، بلکہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کلیاتِ نثرِ غالبؔ کے تمام نسخوں میں "میخانۂ آرزو" جلی قلم سے نمایاں کیا گیا ہے۔

مرزا کی تصنیفات کے نام بہت شاعرانہ ہیں۔ گلِ رعنا۔ میخانۂ آرزو۔ پنج آہنگ مہرِ نیمروز۔ اُردوئے معلّٰی۔ عودِ ہندی۔ سبدِ چیں۔

میں نواب ضیاءالدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی سے ضائع ہو گئے تھے۔ اس لیئے بقولِ غالب پنج آہنگ نامکمل ہے اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

فارسی خطوط

آہنگِ اوّل کا تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ آہنگ دوم میں فارسی صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگ سوم کے اشعار ادبی خوبیوں کے علاوہ اس لیئے بھی کار آمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخ تصنیف تعین کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہوم اور محلِّ استعمال پڑھنا بڑا دلچسپ ہے۔ کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے فارسی خطوط ہیں جن کا بیشتر حصّہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۲ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لیئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں، اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔

مرزا کے اردو خطوط کی سوانحی اہمیت کو سب مانتے ہیں، لیکن سوائے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعاتِ زندگی مختصراً دُہرائے ہیں، ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں نواب مصطفےٰ خاں کے تعلقات کی وجہ سے حالی کو بھی جو نواب کے لڑکوں کے اتالیق تھے، مرزا سے ملنے یا کم از کم شیفتہ اور مرزا کے دوسرے دوستوں سے مرزا کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے موقع ملتے رہتے تھے۔ اس لیئے اس زمانے کے حالات

اور قصّے یادگارِ غالب میں بالتفصیل مندرج ہیں، لیکن مرزا کے ابتدائی حالات میں ابھی تحقیق اور تلاش کی گنجائش ہے، اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اس کے لیئے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں جو اُن کی عمر کے ایک بڑے حصّے کی کم و بیش ایک مکمل تاریخ ہے اور جو اس وقت لکھے گئے۔ جب مرزا کو یہ حالات درپیش تھے۔

اس شخصی اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اس لیئے بھی دلچسپ ہیں کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانہ کی کئی ممتاز ہستیوں سے شناسائی ہوجاتی ہے جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ اُن کی فہرست بہت پُرشکوہ ہے اور اس میں اس زمانے کے اکثر برگزیدہ آدمیوں کے نام آجاتے ہیں۔ چنانچہ شعراء میں سے ناسخ، مومن، شیفتہ، نیر درخشاں اور علماء میں سے مولانا فضل حق، مولانا صدرالدین صدرالصدور۔ قاضی القضاۃ مولانا ولایت حسین (جن کے دوسو کے عطیہ کا غالب نے ایک خط میں ذکر کیا ہے) اور اکابرین سے شہزادہ بشیر الدین میسوری، شہزادہ سلیمان شکوہ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں، سر جیمز طامسن۔ مہاراجہ الور، نواب سعد الدین خاں شفق، مجتہد العصر مولوی سید محمد، حکیم احسن اللہ خاں، نواب میر علی اکبر خاں متولی محسنہ امام باڑہ ہگلی ان سب کے نام مرزا کے دوستانہ خطوط موجود ہیں۔ جن سے نہ صرف مرزا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی ہستیاں تھیں ان سے بھی تعارف ہوجاتا ہے۔

ان خطوط میں بیشتر ذاتی حالات کا تذکرہ ہے، لیکن ان سے اس زمانے

کے عام حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً مرزا نے اپنے سفرِ بنگالہ کی جو صعوبتیں بیان کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، یا جو خط انھوں نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت لکھا ہے۔ اس میں لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ کی ان مصیبتوں کی تفصیل ہے جو انہیں معتمد الدولہ کی نیابت میں برداشت کرنی پڑیں۔ اس کے علاوہ کئی خطوط میں مولوی سراج الدین احمد کو دہلی کی دلچسپ خبریں لکھی ہیں۔ مثلاً ۳۱ جنوری ۱۸۳۶ء کے ایک خط میں مولوی فضل حق کے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے اور دہلی سے روانہ ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ جونہی انھوں نے استعفیٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں نے فوراً پانچسو روپے ماہوار ان کے اخراجات کے لیئے مقرر کر دیئے۔ اور جس روز وہ دہلی سے روانہ ہوئے اہالیانِ دہلی کی بُری حالت تھی۔ ولی عہد شاہ دہلی مرزا ابوظفر نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ایک دوشالہ ملبوس خاص نذر کر کے آنکھوں میں آنسو لا کے نہایت رنج و درد سے الوداع کہا۔ ایک اور خط میں لارڈ آکلنیڈ کے اس فیصلے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی رُو سے تاج محل اور قلعہ آگرہ کی عمارتوں کا سنگِ مرمر اُتار کر بیچ ڈالنے کا ارادہ تھا۔ اور جو آرٹ کی خوش قسمتی سے عمل میں نہ لایا جا سکا۔

حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کر کے فارسی کے دوسرے مشہور نثر نویسوں کی تحریروں سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور اس کی خوبیاں اور خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں، کہ مرزا خود چاہے کچھ کہیں، انہوں نے نثر میں اکثر اُن فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا جن کی

تصنیفات ہندوستان میں لکھی گئیں۔ اور اس امر پر قریب قریب سب فارسی اہلِ زبان متفق ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترک یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کا طرزِ تحریر کسی طرح بھی قابلِ تقلید نہیں۔ ان کتابوں کے مصنف بالعموم موٹے موٹے عربی لفظوں۔ پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب خبط کر دیتے ہیں۔ مرزا بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ اور ظہوری۔ ابوالفضل اور بیدلؔ کی طرح ان کی نثر میں بھی غیر مانوس الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بہت ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ اُن کی آخر عمر کی تصانیف دستنبو اور قاطع برہان کی زبان کسی قدر صاف ہے اور بالعموم فارسی خطوط میں بھی وہ اشکال نہیں جو تقریظوں اور دوسری سنجیدہ اور رسمی تحریروں میں ہے۔ اکثر خطوط کی عبارت صاف اور مؤثر ہے۔ شاعرانہ نازک بیانی سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوط کے مرتبے کو نہیں پہونچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں جو اردو خطوط میں ہے۔ اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے اردو خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی خطوط میں سراسر مفقود ہے۔

بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی دلچسپ شخصیت جو اردو خطوط میں عریاں اور بے نقاب جلوہ نما ہے۔ اس پر فارسی خطوط میں تکلّفات اور رسمی انشاپردازی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس کے دلچسپ اور ہر دلعزیز پہلو کوشش سے ہی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن آخر فارسی اور اردو خطوط دونوں ایک ہی ذہن رسا کے نتائج تھے اور جس طرح بسا اوقات ایک ہی مضمون کو مرزا

نے فارسی اور اردو اشعار میں ادنیٰ اختلاف کے ساتھ نظم کیا ہے، اسی طرح فارسی خطوط میں کئی خیالات اور جذبات ایسے ہیں جنہیں ترقی دے کر انھوں نے اردو میں نہایت مؤثر طریقے سے ادا کیا۔ مثلاً انھوں نے عارف کی موت پر جو غزل لکھی ہے، وہ اردو کے مؤثر ترین مرثیوں میں سے ہے۔ لیکن اس کا چربہ اس سے پندرہ سال پہلے کے ایک فارسی خط میں موجود ہے جو انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کو مرزا احمد بیگ خاں[1] تپاں کی وفات پر لکھا۔

"میگفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدۂ فراموش، بے مروّت راہ گردانید و ناقہ بر منزل دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت جرا بجالِ خرد سالاں نہ بخشید"

یہی آخری خیال ہے جس کو انھوں نے اردو غزل میں نظم کیا ہے

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

کالج کی پروفیسری سے انکار

اب مرزا غالب کی ادبی شہرت مستحکم تھی اور اس سے ان زخموں کا اندمال ہوتا تھا جو مرزا نے تلاش روزگار میں کھائے تھے۔ لیکن وہ اب بھی اپنے آپ کو جاگیردار پہلے سمجھتے تھے۔ اور شاعر و ادیب بعد میں۔ اس نقطۂ نظر کا ایک دلچسپ کرشمہ ۱۸۴۲ء میں ظہور پذیر ہوا۔

---

[1] نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو و جھرکہ کے نسبتی بھائی یعنی امین الدین احمد خاں اور مرزا ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کے ماموں تھے۔ کلکتہ میں مقیم ہو گئے اور ۱۸۳۷ء میں وفات پائی۔

اس سال گورنمنٹ نے دہلی کالج کا ازسرِنو انتظام کرنا چاہا۔ اور مسٹر جیمز ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا جو بعد میں یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے اور مرزا غالب کے سچے بہی خواہ تھے۔ پروفیسروں کے انتخاب کیلئے دہلی آئے۔ فارسی کی پروفیسری کیلئے انھوں نے مرزا کو بلایا۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر سکریٹری کے ڈیرے پر پہونچے اور پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں رُک گئے کہ جس طرح سکریٹری صاحب دربار کے وقت جاگیرداروں کے استقبال کو باہر آتے ہیں۔ وہ آئیں تو میں اندر جاؤں، لیکن نہ سکریٹری صاحب باہر آئے اور نہ مرزا صاحب اندر گئے۔ جب اس طرح کچھ دیر گذر گئی، تو ٹامسن صاحب نے جمعدار بھیج کر تاخیر کا سبب پوچھا۔ مرزا نے کہلا بھیجا۔ کہ چونکہ صاحب حسبِ دستور استقبال کو نہیں آئے۔ اس لیئے میں اندر نہیں آیا۔ اس پر سکریٹری صاحب باہر آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں بحیثیت ایک رئیس کے تشریف لائیں تو آپ کا استقبال ہوگا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیئے آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ کیسے ہو سکتا، جو دربار کے موقع پر درباریوں سے ہوتا ہے، مرزا نے جواب دیا کہ سرکاری ملازمت کا ارادہ اس لیئے ہے کہ خاندانی اعزاز میں اضافہ ہو، نہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی کھو بیٹھوں۔ جب ٹامسن صاحب نے قواعد و آئین کا عذر پیش کیا تو مرزا نے رخصت چاہی، اور بجائے اس کے کہ خاندانی حقوق میں کوئی حقیقی یا خیالی کمی گوارا کرتے، سرکاری ملازمت سے دستکش ہو گئے۔

مشاعروں کی غزلیں

اس زمانے میں دہلی میں جا بجا مشاعرے ہو رہے

تھے، جن میں فارسی اور اردو غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا سب میں تو نہ جاتے۔ لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین کرتے ان میں مرزا زین العابدین عارف آکر کھینچ لے جاتے۔ مرزا نے ان مشاعروں میں کئی غزلیں پڑھیں، جن میں سے چند کے اشعار ہم انتخاب کرتے ہیں ؎

ہرچہ فلک نخواستست، ہیچکس از فلک نخواست
ظرفِ فقیہہ مے نجست، بادۂ ما گزک نخواست

غرقہ بموجہ تاب خورد، تشنہ زدجلہ آب بُرد
زحمتِ ہیچ یک نداد راحتِ ہیچ یک نخواست

جاہ زعلم بے خبر علم زجاہ بے نیاز
ہم محکِ تو زر ندید ہم زرِ من محک نخواست

شحنۂ دہر بر ملا ہرچہ گرفت پس نداد
کاتبِ بخت درخفا ہرچہ نوشت حک نخواست

بحث و جدل بجائے ماں، میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

گشتہ در انتظار پور دیدۂ پیر رہ سفید
دررہِ شوقِ ہمرہی دیدہ زمردمک نخواست

سہل شمردہ سرسری تانہ زلیجز نشمری
غالب اگر بداوری، دادِ خود از فلک نخواست

اس مشاعرے میں جو طرحی غزل انھوں نے پڑھی اس کے دو شعر بہت

پُر لطف ہیں ؎

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید
بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

انھوں نے عرفی کی طرز پر جو قصیدہ "گرستن" کی ردیف میں لکھا ہے۔ وہ بھی نواب ضیاء الدین کے تجویز کئے ہوئے مصرع طرح پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے، کہ جس مشاعرہ میں یہ قصیدہ پڑھا گیا اس میں میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی علالت کی وجہ سے نہ آئے تھے، اور چونکہ فارسی کے قدر دان تھوڑے تھے، مرزا شش و پنج میں تھے کہ یہ قصیدہ وغیرہ پیش کروں یا نہیں۔ لیکن اتنے میں مولانا صدر الدین آزردہ جو ابھی نہیں آئے تھے، آ پہنچے۔ چنانچہ مرزا ایک خط میں نواب مصطفےٰ خاں کو جنہیں وہ مشاعروں کے حالات میرٹھ بھیجا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:-

"بندہ را در زمین "گرستین" نگارش قصیدہ اتفاق اُفتادہ بود۔ آں می سنجیدم کہ ایں ورق را چوں برات نامقبول باز برم و ریختہ گویان را در دسر ندہم کہ از آمدن حضرت آزردہ دل بخود بالیدو زمزمۂ دستوری یافت"

چنانچہ وہ قصیدہ مشاعرہ میں پڑھا گیا۔ اور جیسا کہ یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے بہت پسند ہوا۔

مرزا نے عرصے سے اُردو شاعری قریب قریب ترک کر رکھی تھی، اور ۱۸۴۳ء کے ان مشاعروں میں جن میں اور شعراء نے اُردو غزلیں پڑھیں۔ مرزا نے فارسی اشعار ہی سُنائے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں گا ہے گا ہے انھوں نے اردو غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ جب نواب اصغر علی خاں نسیم نے اس

سال مشاعرہ منعقد کیا۔ اور ذوقؔ۔ مومنؔ اور غالبؔ کو دعوت دی تو مرزا نے اُردو غزل ہی پڑھی ؎

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کیلئے	رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیئے

اس زمانے میں انہیں نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد کی طرف سے دعوت آئی ہوئی تھی، مرزا نے لگے ہاتھوں غزل میں ان کی بھی تعریف کر دی ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے	بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیئے

اسی طرح اس زمانے میں ایک اور عظیم الشان اُردو مشاعرہ ہوا۔ جس میں ذوقؔ اور مومنؔ نے طرحی غزلیں پڑھیں، مرزا نے بھی دو غزلہ کہا ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

اس کے علاوہ مرزا نے مختلف موقعوں پر فارسی قصائد اور قطعات بھی بکثرت لکھے ہیں۔ جب مسٹر جیمز ٹامسن جنہوں نے مرزا کی جاگیر کا سوال نئے سرے سے اُٹھانا چاہا تھا۔ آگرے کے گورنر ہوئے۔ تو مرزا نے اس موقعہ پر دس شعر کا ایک نفیس قطعہ لکھا تھا۔ جس کا پہلا شعر ہے ؎

ہوا عبیر فشاں است و ابر گہر بار	جلوس بگل بسریر حسین مبارک باد

عموماً یہ قطعات مدحیہ ہوتے تھے اور اکثر کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب فتح کیا تو مرزا نے اکیس شعر کا ایک فارسی قطعہ لکھا۔ جو نہ کسی کی تعریف میں ہے اور نہ غالباً کسی کو بھیجا ہی گیا۔ اس میں سکھ فوج کی مذمت کی ہے۔ اس زمانے

کی تاریخی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مذہبی پالیسی کے خلاف مولانا سید احمد بریلوی نے جہاد کا اعلان کیا تو دہلی میں بہت سے لوگ ان کے ہمخیال تھے۔ مہاراجہ کے فرانسیسی جرنیلوں کے خلاف تو مولانا اپنے ساتھیوں کے نفاق کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے، لیکن جب ۱۸۴۶ء میں خالصہ افواج کو انگریزوں نے شکست دی، تو دہلی کے مسلمان بہت خوش تھے۔ چنانچہ مرزا نے بھی یہ قطعہ لکھ کر دل کا غبار نکالا، انھوں نے اس موقعہ پر جو پُر کیف قصیدہ لارڈ ہارڈنگ کی تعریف میں لکھا ہے۔ وہ بھی بہت پُر لطف ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ اگر میں جوان ہوتا تو "حصولِ ثواب" کی "نیت" سے حکومت پنجاب کے خلاف لڑائی میں شریک ہوتا ؎

گزاف شیوۂ من نیست راست میگویم — دریں زمانہ مرا بودے ار زمان شباب
پے شکستن کفار بستمے بہ نبرد — کمر بہ سرخوشیٔ نیتِ حصولِ ثواب

لیکن پنجاب کا امن وامان انہیں جس چیز کے لیئے عزیز ہے۔ وہ کشمیر کی شراب ہے!

کنوں کہ ملک بطیع است وراہ بے خس وخار — زمن بگو بفروشندگانِ بادۂ ناب
شراب قندی ہندوستان وما غم سوخت — زشیرہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

ابرِ گہر بار ادبی نقطۂ نظر سے اس زمانے کی اہم ترین تصنیف مرزا کی فارسی مثنوی ابرِ گہر بار ہے۔ حالی کے خیال میں یہ ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے لیکن جب ۱۸۴۵ء میں سید احمد خاں نے آثار الصنادید لکھی تو اس وقت یہ مثنوی ۱۵-۱۶ اجزو کے قریب ہو چکی تھی۔ اور اس سے زیادہ اب بھی

نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اس مثنوی کے کئی اشعار مہر نیمروز میں درج ہیں جو مارچ ۱۸۵۴ء سے پہلے کی تصنیف ہے۔

حقیقت میں مرزا کا ارادہ حفیظ جالندھری کی طرح شاہنامہ کا جواب لکھنے کا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ جس طرح فردوسی نے رستم کی لڑائیوں کی داستان لکھی ہے۔ اسی طرح وہ ابتدائے اسلام کے جنگوں کو مثنوی کی صورت میں بیان کریں۔ چنانچہ وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں ؎

ز فردوسیم نکتہ انگیز تر | زمرغِ سحر خواں سحر خیز تر
فرو بردنِ شمع سامانیاں | بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنجِ منشور یزدانیم | ز ایمانیاں گویم، ایمانیم
کسے را کہ نازد بہ بیگانگاں | خرد در شمارد ز دیوانگاں
باقبال ایماں و نیروئے دیں | سخن رانم از سید المرسلیں

لیکن انہیں یہ ارادہ پورا کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور وہ حمد و نعت و منقبت اور ابتدائی ساقی نامے سے زیادہ نہیں لکھ سکے۔ نعت کا حصہ صاف اور مؤثر زبان میں ہے۔ اور اس میں چند نئے مضامین بھی پیدا کیے ہیں۔ مثلاً

زخونیکہ در کربلا شد سبیل | ادا کرد وامِ زمانِ خلیل

یا شبِ معراج کی نسبت بھی "سرمۂ چشمِ روز" کی تشبیہ بڑی پُر لطف ہے۔ اور واقعہ معراج کے متعلق لکھا ہے ؎

بہ دور تو شد لن ترانی کہن ! | فصاحت مکرّر نگنجد سخن
ترا خواستگار است یزدانِ پاک | ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

ساقی نامہ میں غالب نے بچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے اور ساقی سے خطاب کیا ہے ؎

بیا ساقی آئین جم تازہ کن ۔۔۔ طراز بساطِ کرم تازہ کن
مُبادا نظامی زراہت برد ۔۔۔ بدستاں سوئے خانقاہت برد
فریبش مخور چوں مے آشام نیست ۔۔۔ ستم دیدۂ گردشِ جام نیست
ورع پیشۂ مسکیں چہ داند ترا ۔۔۔ بہ آرائش نامہ خواند ترا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے اور مناجات اور معراج کے آخری حصے میں شاعری کا جو بلند معیار انھوں نے قایم کیا، اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفسِ مضمون ہی ایسا تھا کہ اس میں شاعرانہ شوخی اور مبالغے کی گنجائش نہ تھی۔ یہ تمام نظم مرزا نے رُک رُک کر لکھی ہے اور خود اس مثنوی کے آخری حصے میں اپنی مشکلات کا ذکر کیا ہے ؎

دریں رہ بسے پیچ سفرہا بسیت ۔۔۔ بود راست لیکن خطرہا بسیت
بزمے کہ دروے بود اجتناب ۔۔۔ زرود و سرود و شراب کباب
سخنور چہ گفتار بیش آورد ۔۔۔ کز اں رنگ بر روئے خویش آورد
دریں بزم اوباش را بار نیست ۔۔۔ مے و ساغر و زخمہ و تار نیست

قید | بہت ممکن ہے کہ مثنوی کے نامکمل رہنے کی ایک وجہ مضمون کی مشکلات ہوں۔ لیکن اس زمانے میں جو مرزا کے ساتھ کچھ بدکر کھیلنے[1] کی بدولت

---

[1] شطرنج کے شوق اور بدکر کھیلنے کی بدولت مرزا کا قانون سے یہ پہلا تصادم نہ تھا۔

مرزا پر ایک حادثہ بھی ایسا گزرا تھا جس کی وجہ سے ان کے کئی ارادے نامکمل رہ گئے ہوں جیسے ۱۸۴۷ء میں قمار بازی کے الزام میں دہلی کی عدالت میں ان پر فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اس کی تفصیلات بمبئی کے احسن الاخبار مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اور چونکہ اس واقعہ کی اس سے زیادہ مکمل تفصیلات اور کہیں نہیں ملتیں۔ ہم متعلقہ اندراج تمام کا تمام درج ذیل کرتے ہیں:۔

"دہلی ۱۵ رجمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمۂ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔"

بادشاہ کی سفارش کارگر نہ ہوئی اور مرزا کو جرمانے اور قید کی سزا ہوگئی۔ چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ دوم جولائی میں لکھا ہے:۔

"مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ جاری تھا اس

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۸) اس سے پہلے ۱۸۴۱ء میں بھی پولیس نے ان کے مکان پر چھاپہ مارا اور بعض دوستوں سمیت جوا کھیلتے گرفتار کر لیا۔ عدالت نے سب کو جرمانہ کی سزا دی۔ مرزا غالب کو بھی سو روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ ملاحظہ ہو دہلی اردو اخبار بابت ۲۲ راگست ۱۸۴۱ء بحوالہ تاریخ صحافت اردو مؤلفہ امداد صابری)

کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دی جائے۔ جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

حال ہی میں سید ناصر نذیر فراق نے لال قلعہ کی ایک ملازمہ کی زبانی، قلعہ اور شہر دہلی کے بعض واقعات جمع کیے ہیں۔ ان میں غالب کے مقدمہ کا بھی ذکر ہے۔ ان کے مطابق مرزا کا مقدمہ کنور روز یہ علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا۔ اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب (مسٹر جیمز طامسن ؟؟) یا کسی اور بڑے افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی گرفتاری اور قید سے اچھی خاصی

سنسنی پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ احسن الاخبار کے علاوہ معاصرانہ تصانیف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ نصیر کے ایک شاگرد منشی گھنشیام داس عاصی دہلوی کا دیوان کالستھ اردو سبھا دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں تاریخ گرفتاری مرزا غالب کے عنوان کے ماتحت کچھ نثر اور ایک قطعہ تاریخ درج ہے۔ شاید عاصی غالب کا دل سے قدردان اور بہی خواہ نہ تھا۔ چنانچہ جو قطعہ تاریخ اس نے لکھا ہے اس سے غالب کی صریح توہین ہوتی ہے۔ لیکن نثر کے اندراج سے گرفتاری کے واقعہ پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے اس لیئے ہم اسے نقل کرتے ہیں:-

"مرزا نوشہ شاعر بے بدل، رندمشرب المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہوگئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرادیا.... بروقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقعہ پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں۔ کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینے کے اندر بہت جمعیتہ تھی اور کچھ امدادی برقنداز پہونچ گئے گرفتار کرکے قید کرادیا۔ بہت سے رئیس و شرفاء اس حرکت سے ناراض تھے اور عدالت میں جرارت کے مساعی ہوئے مگر قید ہوگئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہونچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں   کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چھٹی لکھ کر رہا کرا دیا۔" (کلام عاصی ص ۲۶۳)

سیّد ناصر نذیر فراق اور عاصی نے مرزا غالب کی قبل از وقت رہائی کی جو وجوہات بتائی ہیں ان میں تطابق نہیں لیکن مرزا غالب نے جو وجہ بیان کی ہے۔ وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ حالی نے مرزا کے ایک فارسی خط کا ترجمہ کیا ہے۔

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔ اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اُس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا۔ اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا۔ کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا۔۔۔"

غالب ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ دوسرے ایک معزز اور خاندانی آدمی کے لیئے اس طرح جیل میں جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی تھی ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ مرزا کے رنج و کرب کا ایک باعث یہ بھی تھا۔ کہ

انہیں قید ہوتا دیکھ کر ان کے جاگیر وار رشتہ داروں نے ان سے ایک قلم علیحدگی اختیار کر لی اور اس بات سے آنکھیں چرانے لگے کہ مرزا کے عزیز و قریبی تصور کیے جائیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"جونہی مرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ نہ صرف دوستوں اور ہم جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے کہ مرزا کے عزیز و قریب تصور کیے جائیں۔ اس باب میں لوہارو خاندان کا جو طرزِ عمل رہا۔ وہ نہایت افسوسناک تھا اس خاندان کا کوئی فرد نہ تو اس زمانے میں مرزا سے ملا اور نہ کسی طرح کی اعانت کی۔[1] اتنا ہی نہیں، بلکہ جب آگرہ کے ایک اخبار نے مرزا کا ذکر کرتے ہوئے انہیں خاندان لوہارو کا رشتہ دار ظاہر کیا تو یہ بات ان لوگوں پر بہت شاق گذری اور بہ اہتمام و تکلف اس کی تغلیط کرائی۔ یہ لکھوایا گیا کہ مرزا صاحب سے خاندان لوہارو کا کوئی نسبی تعلق نہیں محض دور کا سببی تعلق ہے۔"

---

[1] غالب اس علیحدگی میں نواب امین الدین والی لوہارو کے مذہبی جذبات کو بھی دخل ہو گا جو میخواری اور قمار بازی سے برافروختہ ہوتے تھے۔ ورنہ وہ غالب کی مشکلات میں مدد کیا کرتے تھے مثلاً جب ۱۸۳۷ء میں مرزا غالب، یوسف خاں سے ملنے گئے ہوئے تھے اور ان پر ایک انگریز تاجر میکفرسن نے ڈھائی سو روپے کی وصولی کے لیے نالش کر رکھی تھی تو پھر اسی عدالت نے انہیں گرفتار کر لیا اور ناظر کے مکان پر لیجا کر روک رکھا اس پر نواب امین الدین نے ہی اصل اور سود کل چار سو روپے دیکر رہائی دلوائی (اخبار "جام جہاں نما" بابت ۸ر جون ۱۸۳۷ء)

مرزا نے قید کے دوران میں جو ترکیب بند لکھا۔ اس سے مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے نامہرباں مہربانوں کے نام تو نہیں گنائے۔ لیکن بعض اشعار میں ان کی طرف صاف اشارہ ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بسکہ خویشاں شد بیگانہ بدنامیٔ من
غیر نشگفت اگر خورد غمِ ناکامیٔ من

ایک اور شعر ہے ؎

جور اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن
طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود

آخری بند میں کئی زہر میں بجھے ہوئے نشتر ہیں۔ دوستوں سے خطاب ہے ؎

ہمدماں درد لم از دیدہ نہانید ہمہ	غالب غمزدہ را روح و رواں نید ہمہ
للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ	للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ
روزے از مہر نگفتید فلانے چوں است	بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
چارہ گر نیست ازاں کرد دعائے کافی است	دل اگر نیست، خداوند زبانید ہمہ

مرزا کے رشتہ داروں نے اس موقعہ پر ان سے جو سردمہری برتی اس سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی دوست نوازی کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے مرزا کی رہائی کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ایک ایک حاکم سے جا کر ملے۔ مقدمہ اور اپیل کے تمام مصارف اپنی گرہ سے ادا کیے۔ اور جب

مرزا قید ہو گئے تو ہر دوسرے روز سوار ہو کر قید خانے میں جاتے مرزا سے ملتے اور ان کی تمام ضروریات کا انتظام کرتے۔

غالب کو بھی اس سچے دوست کی شرافت اور احباب پروری کا پورا احساس تھا۔ ان کا بہترین ترجیع قصیدہ شیفتہ کی تعریف میں ہے۔ اس میں بھی واقعۂ قید کی طرف لطیف اشارہ ہے ؎

نالہ گر در کنجِ زنداں مے زنم — بشنود بے آنکہ باد آں را بُرد
نقش گر بر صفحۂ جاں مے زنم — بنگرد بے آنکہ کلک آں را کشد

لیکن سب سے پُر زور اظہار ترجیع ترکیب بند میں ہے ؎

رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی — خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غمخواریٔ من
پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی — خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بہ میرم، چہ غم از مرگ عزادارِ من است

واقعہ قید کے اثرات

غالب کی زندگی میں واقعۂ قید کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کی زندگی کے بڑے موڑ فقط تین تھے۔ ایک عنفوانِ شباب کا زمانہ جب انھوں نے اپنی ذہنی منزل متعین کی "آئینہ زدودن رصورتِ معنی نمودن" اور ہرمزد وغیرہ کے زیرِ اثر ان کے خیالات میں وسعت، آزادی اور ایک علیحدہ روش خاص سے وابستگی آگئی۔ دوسرے قیامِ دہلی کے اثرات جب طبیعت نے پختگی پائی۔ اور رنگِ بیدل سے نجات ملی۔ تیسرے واقعۂ قید جس سے جاگیرداری کا طلسم درہم برہم ہوا۔ شعر و ادب جو ان کی مادی زندگی میں ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔

نانِ خوردنی کا ذریعہ ہو گئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خیالات میں ایک عظیم داخلی انقلاب ہوا۔

مرزا غالب قید و بند کی رسوائی سے جس بُری طرح متاثر ہوئے اس کا معاصرانہ تذکرہ نگار بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً مولوی کریم الدین طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں: "ان دنوں سرکار کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ گزرا ہے جس کے سبب سے انہیں رنج لاحق ہے"۔ لیکن اس کا صحیح اظہار رجبیہ ترکیب بند میں ہوتا ہے جس میں غالب نے اپنا مرثیہ لکھا ہے۔ اُس غالب کا، جسے وہ دہلی کے جیل خانہ میں دفن کر آئے ؎

منم آں خستہ کہ گر زخمِ جگر بنمایم   بر من از مہرِ دلِ گبر و مسلمان سوزد
منم آں سوختہ خرمن کہ از افسانۂ من   نفسِ راہ رو و رہزن و دہقاں سوزد
از نمِ دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد   از تفِ نالۂ من جوہرِ کیواں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ روشن نشود در شبِ تار   جز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بچراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

لیکن قید کے رنج و غم کا ماحصل فقط آنسوؤں کی قطار نہ تھی۔ اس کے عملی نتائج بھی بہت تھے۔ ایک تو یہ کہ مرزا کی جاگیرداری کا وہ طلسماتی (بلکہ کاغذی) محل جسے وہ اپنے "رکھ رکھاؤ" سلیقے اور کاروانی سے برقرار رکھ رہے تھے، دھم سے زمین پر آ گرا۔ انھوں نے ابھی تک جاگیرداری اور نوابی کی وضعداری قائم رکھی تھی۔ شاید یہ اُمید تھی کہ انگریز اور ہندوستانی دوستوں کی مدد سے کسی ریاست میں کوئی معزز جگہ مل جائے۔ لیکن قید کی ذلت و رسوائی نے یہ سارا طلسم درہم

برہم کردیا۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہوگیا ہوں اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا ہے کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا۔ مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بنکر راہ و رسم پیدا کر لوں"

واقعۂ قید نے غالب کے رئیسانہ خواب اور خاندان لوہارو کی قرابت کا رکھ رکھاؤ قایم رکھنے کے ارمان ختم کر دیئے اور اب وہی مرزا غالب جو سخت ضرورت و احتیاج کے زمانہ میں بھی نائب السلطنت اودھ سے اس لیئے نہیں ملے تھے کہ انھوں نے مرزا کا کھڑے ہوکر استقبال کرنا' اور اپنے ماتحتوں سے مرزا کو نذر دلانا قبول نہ کیا، اور جنھوں نے ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی پروفیسری اس لیئے ٹھکرا دی تھی کہ سکریٹری صاحب ان کے استقبال کے لیئے کمرے سے باہر نہ آئے، اب اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ بہادر شاہ کے دربار میں ایک غیر رئیسانہ ملازمت اختیار کرلیں۔ اور وہ بھی ملک الشعراء ذوق سے کم درجے کی۔

واقعۂ قید کے داخلی نتائج اس سے بھی اہم تھے۔ اب تک مرزا کی روحانی زندگی ایک مسلسل کش مکش کی تھی۔ اس "آویزش بخت و ذرم و طبع جواں" میں مرزا کو کامرانی تو جیتے جی نصیب نہ ہوئی مگر انھوں نے ہمت کبھی نہ ہاری۔ غالب کی شاعری اور زندگی کا ایک نہایت دلچسپ اور جرأت آفریں پہلو' ان کی مسلسل نبرد آزمائی (Resilience) گرگرکے اٹھنا اور ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھلنا ہے لیکن واقعہ قید نے مرزا کی کمر توڑدی۔ سعی و کوشش تو اب بھی انھوں نے ترک نہ کی لیکن

اب انہیں احساس ہوگیا کہ سب باتیں انسانی بس کی نہیں، اور انسانی زندگی میں ایسے مرحلے آجاتے ہیں۔ جب قضا و قدر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں ؎

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود
چہ کنم، چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبود

اور ؎

نتواں کرد با فلک پرخاش ‌‌‌ ‌ خرد خردہ داں نمی خواہم

یہ وہی "خرد خردہ داں" تھی جس پر وہ ایک زمانے میں ناز کیا کرتے تھے اور چند سال پیشتر کہا تھا کہ دہر با تمیز ؎

آں را کہ بخت دسترس بذل مال نبود
طبع سخن رس و خرد خردہ داں دہد

اب ان کے کلام میں رضا و تسلیم کے مضامین زیادہ آنے شروع ہوئے خیالات میں توازن و قرار آگیا۔ اور اضطرار و بیقراری کی جگہ عارفانہ رواقیت نے لے لی۔ ان داخلی تبدیلیوں کا ایک عملی نتیجہ یہ تھا کہ اب مرزا جاگیرداری کے دعاوی سے کنارہ کش ہوگئے تو دوسرا یہ تھا کہ اپنے ادبی نصب العین یعنی اردو کے بجائے فارسی میں اظہار خیال میں بھی شکست تسلیم کرلی اور دربار سے وابستہ ہوکر اردو میں شعر گوئی اور پھر نثر نگاری شروع کی۔ لیکن ان داخلی تبدیلیوں کا اصل عکس ان کے درباری دور کے اردو کلام اور غدر کے بعد کے اردو خطوط میں دیکھنا چاہیئے جن سے ہم آئندہ صفحات میں اقتباسات دیں گے۔

بعض لوگ مرزا غالب کی زندگی کا بحران (سرسید کی طرح) غدر اور مابعد الغدر کے انقلابات میں ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن یہ تلاش بے سود ہے۔ ایک تو جن سماجی قوتوں کی شکست کا مظاہرہ بھی غدر میں ہوا۔ ان کی مہلک کمزوریوں سے غالب غدر سے بہت پہلے آگاہ تھے۔ دوسرے اُن کی شخصی زندگی کا بحران (crisis) غدر سے دس سال پہلے آچکا تھا۔ انھوں نے زندانِ دہلی کی کال کوٹھری میں اور اپنوں کی بیگانگی دیکھ کر حاصل کرلیا تھا۔ غدر کے ہنگامے سے ان کا توازن تہ و بالا نہیں ہوا۔

قید کے واقعہ نے مرزا کی کمر جھکا دی اور اپنے مزعومات میں انہیں بنیادی تبدیلیاں گوارا کرنی پڑیں لیکن حقیقی شکست اب بھی اس مردِ باہمت و باکمال کی نہ تھی۔ بلکہ جب مرزا جاگیرداری کی خیالی بلند پروازیوں اور فارسی ادب کی محدود و مخصوص سربلندیوں سے اُتر کر ٹھوس، سخت زمین پر آگئے۔ تو انھوں نے اسی زمین میں آبیاری اور تخم ریزی کرکے اس میں ایسے شگفتہ پھولوں اور سدابہار درختوں کا اضافہ کیا کہ یہ زمین چمن رشکِ صد آسماں ہوگیا۔

از بسکہ در کشاکشم از کار رفت دست
بندِ مرا گسستن بند استوار کرد

لال قلعہ

دربار میں باریابی

مولانا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کو قید کی پوری میعاد بھگتنی نہیں پڑی اور وہ قریباً تین مہینے کے بعد رہا ہو گئے۔ رہائی کے بعد وہ بہادر شاہ کے مرشد کالے خاں صاحب کے مکان پر مقیم ہوئے اور ان کی سفارش سے دربار میں باریاب ہوئے۔ باریابی سے پہلے وہ بہت سے قصیدے کسی کی معرفت دربار میں پیش کر چکے تھے اور وہاں سے انہیں تحفے تحائف بھی جاتے تھے لیکن ابھی باریابی کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک فارسی قصیدے میں نہایت لطیف طریقے سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

خواہیم قرب شاہ و لیکن دریں مراد
عبرت زنامرادیٔ سنجر گرفتہ ایم

بہادر شاہ کی تعریف میں مرزا کا سب سے پہلا قصیدہ یہی ہے۔ اور بادشاہ کے سال جلوس میں لکھا گیا لیکن اس قصیدے سے بادشاہ کی خفگی دور نہ ہوئی اور

اس کے بعد بھی مرزا کو کئی اور معذرت آمیز قصیدے لکھنے پڑے۔ مثلاً قصیدہ پانزدھم جس کا مطلع ہے ؎

زہے ز خویش نشانِ کمالِ منع الہ — سراجِ دینِ نبیؐ بوظفر بہادر شاہ

اس قصیدے میں دربار سے دوری کی صاف شکایت ہے ؎

شہنشہا ز غم دوریِ درت کارم — بداں رسیدہ کہ بے مرگ جاں دہم ناگاہ

ببارگہ نرسم، خانۂ سپہر خراب — ندیم شاہ نشوم روئے روزگار سیاہ

چہ دل نہم بہ گہر پاشیِ سخن چو مرا — ہزار آبلہ ہر دل بود ز گرمئے آہ

چہ سر کنم روشِ مدح گستری چو مرا — ببزمِ خسروِ گیتی ستاں نیافتد راہ

اس قصیدے سے بھی عتاب شاہی دور نہ ہوا اور مرزا نے ایک اور معذرت آمیز قصیدہ لکھا جو ۱۸۴۱ء کے بعد اور (۱۸۴۵ء سے پہلے کسی وقت تصنیف ہوا ؎

ردیفِ شعر از آں کردم اختیار گرہ — کہ از مشت برابروئے شہریار گرہ

معلوم ہوتا ہے کہ ذوقؔ اور اس کے معاونین مرزا کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے اور اُس کے قلیل الحجم اردو دیوان کا بادشاہ کے سامنے تمسخر اڑاتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اسی زمانہ میں (۱۸۴۵ء سے پہلے) ایک قطعہ میں ذوقؔ سے خطاب کیا تھا ؎

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتہ — کے بہ پُرگوئی فلاں در شعر ہمسنگ من است

لہ یہ قصیدہ اور قطعہ غالب کے پہلے مطبوعہ دیوان (مطبوعہ ۱۸۴۵ء) میں ہیں لیکن بانکی پور لائبریری کے قلمی نسخہ (مکتوبہ ۱۸۴۱ء) میں نہیں۔

نیست نقصان یک دو جزو است از سوادِ ریختہ — کاں دو زم برگے ز نخلستانِ فرہنگ من است
فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگا رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال — مانی و آژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است
کے درخشد جوہر آئینہ تا باقی است زنگ — صیقلی آئینہ ام ایں جوہراں زنگ من است

شاید مرزا کے مخالف بادشاہ کے دل میں مرزا کی وفاداری اور دلی عقیدت کی نسبت بھی شبہے ڈالتے تھے۔ چنانچہ مرزا اسی قطعہ میں کہتے ہیں ؎

شاہ میداند کہ من مداحِ شاہم پاک نیست — گر تو اندیشی کہ ایں دستان نیرنگ من است

لیکن مرزا ان کوششوں کے باوجود باریاب نہ ہوئے اور ۱۸۴۵ء کے بعد بھی انہیں کم از کم ایک قصیدے میں عفوِ تقصیر کی درخواست کرنی پڑی۔ اس پُر زور قصیدے کا مطلع ہے ؎

گفتم حدیثِ دوست بہ قرآں برابر است — نازم بہ کفرِ خود کہ بہ ایماں برابر است

اس کے کئی شعر مرزا کی اپنی حالت کا بیان معلوم ہوتے ہیں ؎

گر چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشی — خود خواہشِ محال بہ حرماں برابر است
با چارہ گر بگوئے کہ تیمار ریش کش — دردلیست درد لم کہ بہ درماں برابر است
زیں موجِ خوں کہ می گذرد دمبدم ز سر — دستارِ من بہ لالۂ نعماں برابر است
کینہائے آشکار کہ سر جوش تازہ دست — در ذوق با نوازشِ پنہاں برابر است
نے وعدۂ نہ پرسشِ رازے نہ شکوہ — داغم ز نامۂ کہ بہ عنواں برابر است
نے کف گرفتہ ساعدِ نے لب ربودہ بوس — در ناخوشی وصال بہ ہجراں برابر است
پیوستہ پرفشاں و رہیدہ ز آشیاں — پرواز من بہ جنبشِ مژگاں برابر است

اس قصیدے میں غالباً ذوق کی طرف اشارہ ہے سہ

بالد بخویش خواجہ چو گوئی سخنورش | غافل کہ ایں ترانہ بہ بہتاں برابراست
نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود ! | نے ہر سخن سرائے سحباں برابراست
نے ہر شتر سوار بہ صالح بود ہمساں | نے ہر شباں بموسئ عمراں برابراست
نے ہر کہ گنج یافت زپرویز گوئے برد | نے ہر کہ باغ ساخت بہ غنواں برابراست

اخیر میں اپنی محرومیٔ قسمت کی طرف اشارہ ہے اور بادشاہ سے عفوِ تقصیر کی درخواست کی ہے سہ

با آنکہ بر سرِ پرشہ افشاندہ ام زکلک | ایں نکتہ ہا کہ با دُرد مرجاں برابراست
اینک مرا زخجلتِ گفتار نارسا | جوش عرق بموجۂ طوفاں برابراست
پوزش پذیرہ کہ رست انگار کز تو ام | خود یک نگہ بہ لطفِ نمایاں برابراست
آرے قبول عذرِ گنہ از گناہگار | با صد ہزار بخشش واحساں برابراست

دربار میں مرزا کے باریاب ہونے کی صحیح تاریخ لکھنا تو مشکل ہے۔ لیکن اتنا یقینی ہے۔ کہ یہ باریابی بہادر شاہ کے مرشد شاہ نصیر الدین عرف کالے شاہ صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ چنانچہ مرزا مہر نیمروز کے آغاز میں لکھتے ہیں:۔

"پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیٔ رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت وخانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد۔ بفروغ ازاں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بفرتابِ دادگری دل افروخت و طرز ہنگ سخن گستری آموخت۔ بہاں درفرد آورد کہ تونیز چوں حلقہ چشمے بباں در دماری و نتوانی کہ دیدہ برداری دیوار کاخِ والا پایۂ ہمسایۂ بیداردل مرد درقدسی سرشت گہر جادہ شناس ماہ سیروسلوک

در ہنلِ جادہ فقر و فنا مشاہدِ مشہودِ شاہدِ یقین مولینا محمد نصیر الدین را نازم کہ ہر کہ بسایۂ آں دیوار ہمایوں آثار گامزند بشگفت کہ سایۂ خویش در فردوس افگند .... نخست آیۂ رحمت کہ برمن از بالا فرود آمد رو دادن نجستگی زمیں بوس گیہاں خدایو خداداں بود دولت روئے آورد بخت از خواب جست“

شاہی مُلازمت

حضرت کالے شاہ کی کوشش سے اتنا ہوا کہ مرزا دربار میں باریاب اور بہادر شاہ کے مُرید ہو گئے ۔ وہ دربار میں حاضر ہوتے ۔ قصائد اور نظمیں پڑھتے ۔ اور انعام اور خلعت پاتے ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہیں دربار شاہی سے کوئی مستقل تعلق نہ تھا ۔ اور پیٹ کا دھندا ابھی باقی تھا ۔ یہ تعلق بادشاہ کے مدار المہام احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی مہربانی سے ہوا ۔ احترام الدولہ مرزا کی فارسی نثر کے بڑے مداح تھے ۔ چنانچہ جب بہادر شاہ کو شاہانِ تیموری کی تاریخ لکھوانے کا خیال ہوا تو انھوں نے مرزا کا نام اس کے لیے تجویز کیا ۔ بادشاہ نے احترام الدولہ کی تجویز پر صاد کیا ۔ اور ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپیہ سالیانہ پر شاہانہ تیموری کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے ۔

مرزا اس کی نسبت مہر نیمروز میں لکھتے ہیں :۔

.... کارپردازانِ شاہی حضرت ظلِ الٰہی بہ خلعت خانہ خاصم بردند ۔ وقامتم را بخلعت شش پارچہ آراستہ بہ سلام گاہم آوردند ۔ خداوند دین و دنیا جگر گوشۂ معدنِ معنی جیغہ و سرپیچ بسرم بست ۔ و رگ جاں ابر نیساں یعنی حمایل مروارید بگردنم آویخت و چاؤش فرخ سروش گہرہائے ترا دیدۂ

رگ ابر خامۂ شاہ بر دین سپاہ بر گوشۂ بارگاہ افشاندہ، وغالب سخن آرا نجم الدولہ دبیر الملک و نظام جنگ خواندہ، و توقیع خدمت تاریخ نویسی تاجداران تیموریہ بنام من نگاشتند۔"

آگرہ کا ایک اخبار (اسعد الاخبار) ۵ ر جولائی ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں یہ خبر اس طرح لکھتا ہے:-

"ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو، مامور کیا۔ اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا۔ اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دیکر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیضیاب ہوگا۔"

ولی عہد کی اُستادی

۱۸۵۰ء میں مرزا بادشاہ کے درباری مؤرخ مقرر ہوئے اس کے کچھ عرصہ بعد ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک نے ان کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ ولی عہد نے غالب کے قدیمی دشمن نواب شمس الدین کی بیوہ کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ مرزا کی ادبی شہرت بہت مستحکم ہوگئی ہوگی

جو ولی عہد نے نواب شمس الدین سے مرزا کی عداوت اور دوسرے واقعات سے چشم پوشی کر کے مرزا کو اپنا اُستاد چُنا۔ ولی عہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تلین بلند پایہ فارسی قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تشبیب میں روزِ ازل کی عجیب روئداد لکھی ہے۔ دوسرا قصیدہ اس بحر میں ہے جس میں آدم الشعرا رودکی نے اپنا ایک مشہور قصیدہ لکھا تھا۔

دادرِ سلطاں نشاں آید ہمے　　　سرورِ گیتی ستاں آید ہمے
شہریاراں نکتہ داناں بودہ اند　　　شہریارِ نکتہ داں آید ہمے
شہریاری با جوانی خوشتر است　　　شہریارِ نوجواں آید ہمے

تیسرے قصیدے کے کئی شعر تغزل کے نقطۂ نظر سے بہت پُر لطف ہیں۔

فریب پرسش پنہاں نگر کہ من ہمہ عمر　　　بذوق وصل ابد ساختم بہجرانش
کسم بہ خود نہ پذیرفت و دہر بازم بُرد　　　چو نامہ کہ بود نانوشتہ عنوانش
ازاں بہ گلشن گیتی نشاط سے درزی　　　کہ بوئے زہر ہمے نشنوی زریحانش

جواں بخت کی شادی

ویسے مرزا کی یہ خوش قسمتی عارضی تھی۔ کیونکہ ولیعہد دو سال بعد چل بسے۔ اور اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے درباری تعلقات نیک پھل لائے۔ کیونکہ ایک تو مرزا کے اُردو خطوط کا آغاز اسی زمانے سے ہوا۔ دوسرے ان تعلقات کی وجہ سے مرزا کو فارسی چھوڑ کر اُردو غزلیں لکھنی پڑیں۔ لیکن ذوق سے حریفانہ کشمکش باقی تھی اور دسمبر ۱۸۵۱ء ہی میں سہرے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ اور غالب نے انور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق کے نام ایک خط میں اس کے متعلق ذکر کیا ہے :-

آزردہ بازسرودستان سرائی ارمغان دارم۔ ہمانا نہ رہنما جوئی شہریار سلیمان جیگار
است گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن و شیرہ بفرمان بانوی بلقیس پرستار
است در ریختہ بیں ردیف ناروا دل آویختن۔ مگر در مقطع غزل سرمستانہ تیرے
زدہ باشم۔ آں یکے کہ گماں کمالے کہ نداشت داشت پنداشت کہ روئے
سخن سوئے اوست۔ در مقطع غزلیکہ سرد بہنجار ستیزہ گام زود دانست
کہ گفتار مرا پاسخ سازد من لب مستی ایں تہ جرعہ کہ فرار یختہ خامہ من است

ع ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

سر بسخن فرو نیاوردم و قطع نظر را دلیل قطعی امتیاز شمردم۔

غالب کے سہرے میں ندرت خیال، رنگینی اور زور ذوق کے سہرے سے زیادہ تھا لیکن ذوق استادِ شاہ تھا۔ اس کے ناراض ہونے سے بادشاہ ناراض ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا کو معذرت لکھنی پڑی ؎

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

بہادر شاہ کے آخری سال اطمینان کے نہ تھے[1]۔ نواب زینت محل شہزادہ جواں بخت کی ولیعہدی کے لیے کوشاں تھیں۔ لیکن حکام انگریزی اس کے خلاف تھے اس کے علاوہ بادشاہ کی اپنی صحت خراب تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۱ء

---

[1] بادشاہ نے اوائل ۱۸۵۴ء میں جو فارسی مثنوی غالب سے لکھوا کر اپنے نام سے لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں شائع کروائی۔ اس کے دو دردناک اشعار ہیں ؎

دیدہ باشد کہ شہریار نہ ایم
کار فرمائے بندہ دار نہ ایم

شاہی من بجز ربا ہست نیست
بہر من پایۂ سیاست نیست

گورنمنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے اور حج کے لیے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

مہر نیمروز مہر نیمروز یعنی شاہان تیموری کی تاریخ دو قسطوں میں مکمل ہوئی شروع میں مرزا غالب نے امیر تیمور سے ہمایوں تک کے واقعات لکھے[1] تھے اور جنوری ۱۸۵۱ء سے پہلے اس کو مکمل کر لیا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں نے انہیں ابتدائے آفرینش سے امیر تیمور تک کے واقعات جمع کر کے دیئے جنہیں مرزا غالب نے اپنے طرز میں لکھا اور مسودے کو پھر سے ترتیب دے کر کتاب کو حضور میں پیش کیا۔ وہاں سے انہیں ایک "توقیع خوشنودی" یعنی "شقہ" "مشتمل بر تحسین" "اظہار عنایت" ملا۔ اور کتاب ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے ایما سے مطبع فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہوئی۔ لیکن اس کا دوسرا حصہ (ماہ نیم ماہ) لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ معلوم نہیں کیونکہ بادشاہی سلسلہ پہلے حصہ کی تکمیل کے چار پانچ سال بعد تک قائم رہا۔ لیکن ممکن ہے کہ بہادر شاہ جو سادہ اور مؤثر طرز تحریر پسند کرتا تھا اُسے مرزا کی ٹیڑھی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا پسند

---

[1] اس حصہ کتاب کے لیے غالب کو تاریخی کتب دیکھنی پڑیں۔ چنانچہ تزک تیموری، ظفرنامہ تیمور، مطلع السعدین۔ حبیب السیر۔ روضۃ الصفا کے حوالے ان کی تحریر میں ملتے ہیں۔ ایک دلچسپ اندراج وہ ہے۔ جہاں ہمایوں کی فتح بنگالہ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا نے اپنے قیام بنگالہ کو یاد کیا ہے۔ اور کوئی آدھا پونا صفحہ اس سبزہ زار کی تعریف کے لیے وقف رکھا ہے مغلوں کے جانی دشمن شیر شاہ کے نیک کاموں کی انھوں نے جس طرح تعریف کی ہے، ایک عام درباری مؤرخ سے اس کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔

ہوا ہوا اور اس نے اس کتاب کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہندوستانی محاوروں سے پاک ہے۔ لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے اس پر اُن کی بتائی ہوئی پیاز کی مثال صادق آتی ہے کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں مغز کا نام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیمروز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ اسے آخری مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مؤرخ نے لکھا، بہت ہونی چاہیئے کچھ بھی نہیں۔

۱۸۵۲ء میں مومنؔ نے وفات پائی۔ مومنؔ ایک بلند مرتبہ شاعر تھا اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق۔ مرزا کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا جس کا اظہار انھوں نے ایک فارسی رباعی میں کیا ہے ؎

شرط ست کہ زوئے دل خراشم ہمہ عمر — خوں تا بہ رُخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومنؔ — چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

لیکن اس سال کے جس سانحہ کا انہیں مرگ مومنؔ سے بھی زیادہ رنج ہوا وہ مرزا زین العابدین عارفؔ کی وفات تھی۔ عارفؔ غالبؔ کی بیوی کے بھانجے تھے اور چھوٹی عمر میں خوب شعر کہتے تھے۔ مرزا کو وہ بہت عزیز تھے اور ان کی نسبت انھوں نے ایک فارسی قطعہ بھی لکھا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارفؔ نام — کہ رخش شمع دُودمان منست
از نشاطِ نگارش نامش — خامہ رقاص در بنان منست
آنکہ در بزم قرب و خلوتِ اُنس — غمگسارِ مزاج دانِ منست
زور بازوئے کامرانی من — راحتِ رُوحِ ناتوانِ منست

عارف نے اپریل ۱۸۵۲ء میں عین جوانی میں وفات پائی اور مرزا نے ایک دردناک مرثیے میں درد وغم کے آنسو ٹپکائے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرحوم کے دو بیٹے تھے حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ مرزا پہلے حسین علیخاں اور پھر باقر علی خاں ہر دو کو اپنے پاس لے آئے۔ اور انہیں اپنے بچوں کی طرح بڑے لاڈ پیار سے پالا۔

مرزا نے اودھ کے تین یا چار بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ لیکن دربار اودھ سے انہیں مدح کا صلہ پہلی مرتبہ واجد علی شاہ کی طرف سے ملا۔ وہ مجتہد العصر مولانا سید محمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"سہ شنبہ یازدہم ماہ صفر توقیع خدایگانی و پنجشنبہ سیزدہم ماہ خطبۂ سلطانی تشریف ورود ارزانی داشت ..... چنیں ناخوش ہنگام کہ دیدہ و بام مردم دیدہ سیاہ پوش و شہر از آشوب ستیز کفر و اسلام پرخروش باشد، بندہ پروران دید بیں خوبی کہ در حوصلۂ امکان نگنجد۔ کاری را سرہ کردن اگر معجزۂ امامت نیروئے ولایت نیست دیگر چیست؟

اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں۔ لیکن اس میں لکھنؤ کے کسی ہندو مسلم بلوہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ مجتہد العصر جن کے ایما پر غالب نے اُردو مرثیے کے تین بند بھی لکھے تھے۔ غالب کے قدردان اور مربی تھے۔ وہ غالب کے قصائد دربار میں پیش کرتے اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ مرزا سے ایک فارسی مثنوی کی تصنیف کی بنا پر ناخوش تھا تو

انھوں نے مرزا کی وکالت کی اور انہیں عتاب شاہی سے بچایا۔ غالبؔ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ دربار اودھ سے ان کے نام پانسو سالیانہ بھی مقرر ہوا تھا۔ لیکن یہ بہت دیر تک ملنے نہیں پایا کہ اودھ کی سلطنت جاتی رہی۔ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ بطور اسیر سلطانی کلکتے بھیج دیئے گئے۔

بادشاہ اور نواب رامپور کی اُستادی

مرزا کی زندگی اب نسبتاً آرام سے گذرتی تھی۔ مالی حالت قدرے بہتر تھی۔ قلعہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا شاہزادوں میں کوئی نہ کوئی ہر ہفتے مشاعرہ منعقد کراتا۔ مرزا ان میں اردو غزلیں پڑھتے۔ اور چونکہ ان کا موجودہ رنگ مقبول عام تھا۔ تعریفیں ہوتیں ۱۸۵۴ء میں ولیعہد سلطنت فتح الملک مرزا محمد سلطان غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو غالبؔ کے شاگرد ہوئے اور ان کی سرکار سے چارسو روپیہ سالیانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ذوقؔ سے اب بھی مرزا کے تعلقات نسبتاً خوشگوار تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مجلس برہم ہونی شروع ہوئی مومنؔ کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا تھا۔ اور اس کے دو سال بعد ۱۶ راکتوبر ۱۸۵۴ء کو ذوقؔ بھی چل بسے[1]۔ مشہور شعراء میں اس وقت غالبؔ کے سوا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے

---

[1] مرزا نے تاریخ لکھی ؎

تاریخ وفات ذوقؔ غالبؔ   باخاطر دردمند و مایوس
خوں شد دل زار تا نوشتم   خاقانی ہند مرد افسوس

۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء

سپرد ہوئی۔

اس اعزاز سے بھی اہم واقعہ دربار رامپور سے مرزا کا تعلق تھا جس کا آغاز اس کے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کے شروع میں ہوا۔ یہ تعلق مولوی فضل حق کی وساطت سے پیدا ہوا جنہیں نواب یوسف علی خاں کی علم پروری رامپور کھینچ لے گئی تھی۔ اُن کے ایماء پر مرزا نے ایک فارسی خط نواب صاحب کی خدمت میں لکھا اور اس کے بعد اپنا دیوان اور ایک فارسی قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم | بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

نواب کی خدمت میں بھیجے۔ نواب صاحب جو اس سے پہلے دلی میں مرزا سے فارسی پڑھ چکے تھے۔ اب فن شعر میں بھی ان کے شاگرد ہوئے اور گاہے گاہے ان کی مالی امداد کرتے رہے۔ اس ہنگامی مدد کے علاوہ اردوئے معلّٰی کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانی لوگوں کی دریوزہ گری اور فاقہ کشی تک کی نوبت آئی تھی۔ وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا۔

بہادر شاہ اور مرزا غالب

بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزا نے دو تین سال کی ہوگی۔ اس سلسلے میں انہیں بادشاہ کی طرف سے ملک الشعراء یا اس طرح کا کوئی اور خطاب انہیں ملا۔ اور ممکن ہے کہ بادشاہ ان کے طرز شاعری کا بہت مداح نہ ہو۔ حالی نے ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزاد کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بہادر شاہ کے استادوں کو ایک پھول اور ایک کلی سے پورا گلدستہ

بنا کر دینا ہوتا تھا۔ ظفر کی نسبت یہ روایت عام ہے۔ لیکن ظفر اور غالب کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کلیاتِ ظفر میں غالب کے خاص رنگ کی ایک غزل نہیں۔ اور اگر کلیات ظفر کا عام معیار دیکھا جائے تو یہ خیال کہ اس میں غالب کے نتائجِ فکر بھی شامل ہیں۔ غالب کی شاعرانہ شہرت کے لئے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا۔

مرزا ملک الشعراء تو نہ ہوئے لیکن دبیر الملک وہ ایک عرصے سے تھے۔ اور فارسی زبان کے بہترین انشا پرداز سمجھے جاتے تھے۔ انہیں کئی موقعوں پر فرمانروائے دہلی کی ترجمانی کرنی پڑی تھی۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں جب بہادر شاہ کے شیعہ ہو جانے کی شہرت ہوئی اور دہلی کے علماء و مشائخ نے بادشاہ کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عید کے خطبوں سے اس کا نام نکال دیا جائے گا۔ تو بہادر شاہ نے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر اس افواہ کی تردید کی۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک کتاب "حقیقتِ مذہبِ اہلِ سنت والجماعت" پر تصنیف کی جس پر مرزا نے زور شور سے تقریظ لکھی اور خاص و عام کو اعلیٰ حضرت کا ثباتِ قدم مسلکِ تسنن پر باور کرایا۔"

مرزا کو تصوف سے تھوڑی بہت دلچسپی تو فارسی شعر کے لگاؤ سے ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اب بہادر شاہ کی صحبت نے اسے اور ترقی دی۔ چنانچہ ان کے اشعار میں صوفیانہ خیالات زیادہ آنے لگے۔ اور جب سنہ ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ کے ایما پر مفتی میر لال نے صوفیانہ اشغال و افکار کا مجموعہ تیار کیا تو اس کے شروع میں مرزا نے ایک دیباچہ لکھا جس کی نسبت

حالی کا بیان ہے: "اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ان کے لحاظ سے کہا .... جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات" نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے لکھے۔

قلعہ شاہی سے اپنے تعلقات کی مختصر روئداد غالب نے ۱۸۵۷ء میں دستنبو میں بیان کی تھی:۔

> ہفت ہشت سال است۔ کہ اورنگ نشین دہلی سوئے خودم خواندہ، نگرد ار گزاری جہانجویان تیموریہ بہ دست مزد کشش صد روپیہ از من خواہش پزفتیم وبدان کار پرداختم پس از چندے کہن استاد شاہ را مرگ فرا آمد۔ آموزگاری شیوۂ سخن نیز بہ من باز گشت۔ پیری و ناتوانی و انگاہ خو پذیرد گوشہ گیری و تن آسانی۔ با این ہمہ از گرانی گوش بار دلہائے دگران بودن و ہر کہ در انجمن سخن گوید سوئے لبش نگران بودن ناکام۔ در ہفتہ یک دو بار بہ ارک رفتمے۔ و اگر شاہ از شکوئے برآمدے۔ لختے بہ پیشگاہ ایستادمے ورنہ بہ دریخانہ دمے چند نشستمے و باز آمدمے۔ ہر چہ در این و رنگ رنگ نگارش یافتے یا خود بردمے یا فرستادمے"

یہ صحیح ہے کہ یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب مرزا کے لیے معزول شاہ سے ارتباط ظاہر کرنا مضر ہوتا لیکن غالب اور بہادر شاہ کے تعلقات کی جو طویل داستان ہے۔ اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ قلعہ دہلی سے مرزا کا تعلق "آسائش بیرے آرش پاک از آلائش" سے زیادہ نہ تھا۔ اور

ان کے اور بادشاہ کے درمیان وہ یگانگت اور ارتباط نہ تھا جو بہادر شاہ اور اس کے پہلے استاد کے درمیان تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے دیرینہ قدردان حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام شاہی اور مرشد شاہ میاں کالے صاحب کی مدد سے مرزا نے قلعہ تک راستہ نکال لیا تھا۔ اور اپنی عقل و سمجھ سے درباری تعلقات نباہتے گئے۔ ورنہ ان کے اور بادشاہ کے درمیان دلی ارتباط کا سامان نہ تھا۔

بہادر شاہ نے غالب کو اس طرح انعامات و خطابات نہیں دیئے جس طرح ذوق کو ملے تھے۔ لیکن دربار شاہی میں وہ ذوق سے زیادہ شوخ گفتار اور بے تکلف تھے۔ وہ خود ایک امیر خاندان کے رکن تھے۔ فن ندیمی کی تمام جزئیات پر دسترس رکھتے تھے۔ بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ اس سے ان کے اور بہادر شاہ کے تعلقات میں ایک ایسی شگفتگی اور بے تکلفی نظر آتی ہے جو منشی ذوق اور ظفر کے تعلقات میں نہ تھی۔

حالی نے غالب اور بہادر شاہ کے ذکر میں دو تین لطیفے نقل کیئے ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ، اس زمانے کے اشعار سے ان دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور مرزا کی ظرافتِ طبع کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ جب رمضان گذر گیا اور مرزا دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے پوچھا کیا۔ مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے؟ مرزا نے عرض کیا، پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔

شاید اسی موقع پر ذیل کا قطعہ دربار شاہی میں پڑھا گیا:۔

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

یہ رباعی بھی اس قطعہ کے ساتھ پیش کی گئی ؎

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

اس زمانے کی غزلوں میں بھی شوخ اشعار کی کثرت ہے ہم لکھ چکے ہیں کہ اخیر ۱۸۵۱ء میں بہادر شاہ نے حج پر جانے کا ارادہ کیا۔ غالبؔ نے اس زمانے میں جو غزل لکھی۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

غالبؔ اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

شاہی سوغاتوں کی رسید میں مرزا نے جو اشعار لکھے۔ ان میں بھی شکریے اور مدح و ثنا سے زیادہ تفنن طبع نمایاں ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے مرزا کو الوشش کے طور پر بیسن کی ایک روغنی روٹی بھیجی۔ اس پر مرزا نے ایک اردو قطعہ لکھا ؎

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدمؑ یہ بیسنی روٹی

مرزا کو شروع میں ششماہی گزرنے پر چھ مہینے کی تنخواہ اکٹھی ملا کرتی تھی۔ مرزا چاہتے تھے کہ ماہ بماہ ملے۔ ایک نہایت ہی پُرلطف قصیدے میں بادشاہ سے کہتے ہیں ؎

میری تنخواہ جو مقرر ہے | اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک | خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات | اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض | اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا | ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں | شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان اگر سنیئے | ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے | ہے قلم میری ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد | قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا | آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

فرمانروائے انگلستان کی مدح

مرزا بادشاہ کے استاد تو ہو گئے لیکن اب بادشاہت ہی ختم ہو رہی تھی۔ جب بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوا تو اس سے کہا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر بادشاہ کے جو حقوق ہیں۔ ان سے دستبردار ہو جاؤ۔ لیکن بہادر شاہ اپنی بے دست و پائی اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے حقوق پر اڑے رہنے کا عادی تھا، وہ نہ مانا، مگر وہ اب خود زندگی سے دستبردار ہونے والا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء میں فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی خاندان قلعہ کے بجائے قطب کے

جوار میں رہے۔ اس پر ریذیڈنٹ سے نواب زینت محل کی بڑی جھڑپ ہوئی لیکن یہ فیصلہ برقرار رہا اور اس کے دو سال بعد جب مرزا قویش کا ولیعہدی پر تقرر ہوا۔ تو طے پایا کہ ایک تو بہادر شاہ کے جانشین کو بہادر شاہ سے پنشن کم ملے گی۔ دوسرے اس کا خطاب بادشاہ نہیں بلکہ شاہزادہ ہوگا یعنی شاہی سلسلہ بہادر شاہ کی ذات کے ساتھ ختم ہو جائے گا[1]۔

مرزا احکام رس تھے اور ان باتوں سے بے خبر یا غافل نہ تھے۔ ۱۸۵۲ء ہی میں جب بادشاہ بیمار ہوا۔ تو وہ اپنے مستقبل کی نسبت متردد تھے۔ اس زمانے کے ایک خط میں منشی ہیرا سنگھ کو لکھتے ہیں:۔

"از شب عید خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رونماید و بمن کہ در سایہ دیوارش غنودہ ام چہ رود۔"

اب جو بہادر شاہ کی جانشینی کے متعلق آخری فیصلہ ہوا تو انھوں نے سوچا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائے گا۔ اپنا مستقبل اصل شاہان دہلی یعنی انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اس کے ساتھ ایک عرضداشت تھی کہ روم و ایران کے بادشاہ شعراء پر بڑی بڑی عنایتیں کرتے ہیں۔ اگر شہنشاہِ انگلستان مجھے خطاب اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو کوئی

---

[1] غالباً اسی موقعہ پر ظفر نے لکھا تھا ؎

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت — بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

تعجب کی بات نہیں۔ یہ تفصیلات مرزا کی اپنی زبان سے سنیئے:۔

"دراں پوزش نامہ از آزو آرزو بدیں انداز نشاں دادہ آمد کہ خسروان روم وایران و دیگر کشور گیران را با سخن گستراں و ستائش گراں در بخشائش و بخشش رنگا رنگ شمار رفتہ و دہن بہ گہر انباشتن و پیکر (بہ) زر سنجتن و دہ دادن و گنج فشاندن بکار رفتہ ایں سخن گستر ستائش گر مہر خوانے از زبان شہنشاہ دسراپائے بفرمان شہنشاہ و نان ریزہ از خوان شہنشاہ میخواہد۔ ہمانا مہر خطاب و سراپا و نان ریزہ گفتار خطاب و خلعت و چہم نان ریزہ در انگریزی زبان پنشن تواند بود۔"

غالب کو لندن سے اس خط کا جواب آخیر جنوری ۱۸۵۷ء میں مسٹر رسل برک کی طرف سے ملا کہ درخواست پر تحقیق کے بعد خطاب اور خلعت کے متعلق حکم صادر ہوگا۔ مرزا کے لیئے یہ جواب بہت حوصلہ افزا تھا۔ اور وہ معلوم نہیں امیدوں کے کیسے کیسے قلعے باندھ رہے تھے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر ہوگیا۔

دہلی کی بربادی!

دستنبو غدر کے دوران میں غالب کے واقعاتِ زندگی تلاش کرنے کے لیئے ہمیں ان کے خطوط اور قصائد میں کرید کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے کے حالات اُن کی کتاب دستنبو میں درج ہیں۔ جس میں انھوں نے غدر دہلی کے بعض واقعات جمع کیئے ہیں۔ سوانحی دلچسپی کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو شروع غدر سے آخیر تک دہلی

میں موجود رہا۔ اور جس کی راست گوئی کے دوست دشمن معترف ہیں لیکن یہ خیال کہ مرزا نے اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اور آزادی سے لکھ دیئے ہوں گے صحیح نہیں۔ وہ خود ایک اُردو خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو جو کتاب کی اشاعت کے متعلق شامل تھے لکھتے ہیں:-

"ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا۔ اور ایک بذریعان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو طرز تحریر کیا ہوگی۔ اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا؟"

اس کتاب کی زبان مہر نیمروز سے صاف ہے اور اگرچہ عربی الفاظ حتی الوسع ترک کرنے سے جابجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے پڑے ہیں۔ تاہم شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب خبط نہیں ہوتا۔ شروع میں فلسفیانہ انداز میں تسلیم و رضا کا سبق دیا ہے۔ اور اپنے کئی اشعار نقل کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ راحت کا راستہ رنج کی وادی میں سے نکلتا ہے یعنی ع:-

در پردۂ ناخوشی خوشی پنہاں است

اور ؎

چنداں جنبش سپہر بفرمان داور است | بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

واقعاتِ غدر دستنبو میں بیشتر تو ان حادثات کی تفصیل ہے۔ جو مرزا پر گذرے لیکن اس کے علاوہ عام حالات کا تذکرہ بھی ہے۔ شروع میں ابتدائی عبارت اور اپنے تذکرہ کے بعد ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے واقعات لکھے ہیں۔ جب میرٹھ سے باغی فوج آئی اور دہلی میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ اس میں مؤثر ترین حصہ انگریز

بچوں اور عورتوں کے متعلق ہے جن کے قتل کا مرزا کو سخت قلق تھا۔

"ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغوان زار نشد و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانا بزخمۂ نو بہار رنہ شد۔ ہائے آں جہاندارانِ داد آموز اندوز دانش نکوخوے نکو نام وہ آہ زاں خاتونانِ پری چہرہ نازک اندام بارُخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام و دریغ آں کودکان جہاں نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل مے خندیدند و در خوشخرامی بر کبک و تدرو آہو میگرفتند کہ ہمہ یک بار بہ گرداب خوں فرو رفتند؎"

اس قتل عام کے بعد جو لوٹ مار رہا ہوئی۔ اس کی تفصیل دی ہے،۔

"خسانیکہ بروز از بہر فرد ختن خاک زمین مے کافتند در خاک خودۂ زر یافتند کسانیکہ بشب در بزم مے از آتش گل چراغ می افروختند در کلبۂ تاریداغ ناکامی سوختند۔ زیور و پیرایۂ لولیان شہر جز آنما یہ کہ در گردن و گوشِ زن و دختر شب گرد ستا ہمہ در کیسۂ شبروان بیکار ناجوانمرد ست؎"

اس قتل و غارت کے بعد باغیوں نے قلعہ کا رُخ کیا اور مرزا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بہادر شاہ کے اُس دعوےٰ کی تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ غدر کے دوران میں مجبور تھا۔ اور سپاہ کا حاکم نہیں بلکہ محکوم تھا۔ مرزا لکھتے ہیں:"چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند، سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند؎

شاہ را در میان گرفت سپاہ　　　دیں گرفتن بود گرفتنِ ماہ
شاہ ماہ گرفتہ را ماند　　　نہ کہ ماہِ دو ہفتہ را ماند

دہلی سے انگریزوں کا انتظام اُٹھنے اور دوبارہ دہلی فتح ہونے تک جو

حالات رونپذیر ہوئے۔ ان کی تفصیل نہایت مختصر ہے اور فقط پانچ چھ صفحوں میں اس چار مہینے چار دن کی سرگذشت ختم کردی ہے[1]۔ کتاب کا زیادہ حصہ ان تکالیف کا بیان ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا اور ان کے عزیزوں کو پیش آئیں۔ اور جنہیں انھوں نے نہایت دردناک طریقے سے قلمبند کیا ہے۔

فتح دہلی ۱۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ مرزا اس دن کی سرگذشت لکھتے ہیں:۔

"کشور گیران شہر وارک۔ تا سر گرفتند۔ غوغائے زدوکشت وگیرودار تا بدیں کوچہ نیز رسید۔ وہمہ را از بیم دل دو نیم شد۔ ماندوست کرایں کوچہ جز یک راہ بیش ازدہ دوازدہ خانہ ندارد۔ جز دو چاہ دریں کوئے نیست بیشتر از زن و مرد بدیں نورد کہ زن راب چہ در آغوش است و مرد را پشتوارہ بردوش بدر زدند۔ تنے چند کہ بجا ماندہ بہمدستانئے من کہ از سخن پذیری گریزندگشتم دراز دروں بستند و پیراہن آں سنگ لبنگ بہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سر بستہ و دربستہ نیز شد۔"

اس قید خانے کے باہر شہر کی جو حالت تھی اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"درہمہ شہر از پانزدہم ستمبر ہر خانہ و ہر کلبہ را در فراز است۔ و فروشندگان وخوزدگان ناپید اگندم فروش کجا کہ دانہ خرندگا ذرکو کہ جامہ بہر شستن بدے سپرند گرا را کجا جریند کہ موئے سر سترد۔ وپاکار را کجا یابند کہ پلیدی ببرد۔"

---

[1] ممکن ہے کہ مرزا نے ان ایام کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہوں لیکن فتح دہلی کے بعد ان کی اشاعت نامناسب خیال کی ہو۔

غالب اور اُن کے ساتھیوں کا باہر سے تعلق منقطع ہوا تو پانی وغیرہ کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

"خوش و ناخوش از خورش ہر چہ لختے بود خوردہ شد۔ و آب بداں کوشش کہ پنداری چاہ بناخن کندہ اند آشامیدہ آمد۔ و دیگر در کوزہ و سبو آب و در مرد و زن تاب نماند و دو شانہ روز در تشنگی و گرسنگی گزشت"۔

جب دو دن اس طرح بے آب و نان گذر گئے۔ تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں کے خاندانی مکانوں کی حفاظت کے لیئے جو سپاہی بھیجے تھے وہ آ پہنچے۔ لوگوں کو جان کا ڈر تھا۔ وہ کم ہوا تو انھوں نے سپاہیوں سے پانی کے لیئے استمداد کیا۔ چنانچہ انھیں بازار کے سرے تک جانے کی اجازت ملی۔ اور ہر گھر سے ایک ایک دو دو آدمی خم و سبو اُٹھائے پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیکن میٹھے پانی کے کنوئیں دور تھے۔ اور وہاں تک جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ناچار ایک نمکین کنوئیں سے ہی پانی بھر لائے۔ اور اس سے پیاس کی آگ بجھائی۔ لیکن نمکین پانی سے کہاں تسکین ہوتی ہے، لوگ نڈھال ہو رہے تھے اور مرزا تسکین دیتے تھے کہ جو ہمارا روزی رساں ہے وہ ہمیں بھلائے گا نہیں۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی دعائیں قبول ہوئیں۔ ایک روز بادل آئے اور خوب مینہ برسا۔ لوگوں نے چادریں باندھیں اور ان کے نیچے گھڑے رکھ کر پانی جمع کیا۔ اور اس آبِ حیات سے اپنی پیاس بجھائی۔

دہلی کی جانکنی

انگریز ۲۰ ستمبر کو دہلی میں داخل ہوئے اور اس "شہر ستم بہر" کی جانکنی شروع ہوئی۔ دہلی نے اس سے پہلے بھی دہشت

اور ظلم وستم کے دور دیکھے تھے، لیکن وہ اس منظم تباہی اور بربادی کے مقابلے میں کچھ نہ تھے۔
جو غدر کے بعد اہلِ دہلی کو پیش آئے، نادری قتلِ عام، جاٹوں کی لوٹ، مرہٹہ گردی،
ان سب کی نوعیت کیا تھی اور وہ کتنے روز جاری رہے؟ نادری قتلِ عام کی نسبت تو
کہا جاسکتا ہے کہ اس کا سبب محمد شاہ اور نادر شاہ کی صلح کے بعد، شہر بانِ دہلی کے
ہاتھوں نادری سپاہیوں کا احمقانہ قتل عام تھا جس میں پانچ ہزار یا ایک دوسری روایت کے
مطابق تین ہزار قزلباش مارے گئے۔ لیکن نادری قتل عام اور جاٹوں کی لوٹ
کتنے دن جاری رہی؟ نادری قتل عام صبح کو شروع ہوا اور شام کو ختم ہو گیا
لیکن غدر کے بعد شہریوں کا قتلِ عام بہت دنوں تک جاری رہا۔ کمشنر دہلی کی بیوی
مسز سانڈرس اس زمانے کے ایک نجی خط میں لکھتی ہیں "فتح دہلی کے کئی روز
بعد تک جو دیسی آدمی نظر آتا تھا، فوجیوں کے ہاتھوں سے مارا جاتا"

8. For several days after the assault every native that could be found was killed by the soldiers.

جب بہت دنوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا اور اس سلسلہ کو ختم ہونا ہی تھا،
کیونکہ جو لوگ کہیں چھپے ہوئے نہیں تھے یا شہر سے باہر نہیں بھاگ گئے تھے وہ
ختم ہو چکے تھے ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

برہان الملک نے تو نادر شاہ کے سامنے یہ شعر پڑھ کر نادری تیغ غضب کو

میدان میں ڈلوا لیا تھا۔ لیکن میجر ہڈسن جیسے جابروں کے سامنے جانے کی کسے ہمت ہوتی۔ اور وہاں یہ باتیں سمجھتا کون؟۔

اب شعر کے دوسرے مصرعہ پر عمل شروع ہوا۔ اور مخبروں کے ذریعے ان لوگوں کا کھوج نکالا گیا جو کہیں چھپے ہوئے تھے۔ یا بعد میں آگئے تھے ان کو مارشل لا کورٹ کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اور مخبروں کی جھوٹی سچی گواہیوں پر بڑے بے گناہوں کو سزائے موت کا حکم ہوا[1] شہر کے چوک میں شارع عام پر پھانسی گڑی ہوئی تھی۔ جسے سزائے موت ملتی اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا بقول غالب ؎

چوک کہتے ہیں جس کو مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

لوٹ کا سلسلہ اس سے بدتر تھا۔ پہلے زمانے میں، اگر کبھی عام لوٹ ہوئی (اور لوٹ کا ایسا عام سلسلہ کبھی مرہٹوں اور جاٹوں نے بھی نہیں کیا تھا) تو کم از کم مالک کا مکان تو پاس ہوتا وہ کچھ بچا چھپا لیتا۔ لوٹنے والے ہی کو رحم آجاتا۔ اور بہر کیف نہب و غارت کا یہ سلسلہ دو چار روز میں ختم ہو جاتا۔ لیکن اب یہ کیفیت تھی کہ تمام شہری آبادی شہر سے باہر تھی۔ ہندوؤں کو جنوری ۱۸۵۸ء سے پہلے اور مسلمانوں کو اس کے ایک طویل عرصہ بعد تک واپسی کی اجازت نہ ملی، لوٹنے والے اطمینان اور باقاعدگی سے مہینوں مکانوں کو توڑ پھوڑ کر چھپے ہوئے خزانے نکالتے اور اندوختے سنبھالتے۔ لوٹنے والوں کو Prize Agents کا سرکاری نام دیا گیا تھا۔ لوٹنے والے لوٹ کا بہت سا حصہ تو اپنے پاس رکھتے کچھ فوجی منتظمین کے پاس پیش ہوتا۔ جس میں سے وہ کچھ اپنے پاس رکھتے اور کچھ

---

[1] مثلاً میکش ایک زمانے تک بچا رہا اور بقول غالب ۱۸۵۸ء کے شروع میں "چین میں" تھا۔ اور

نیلام کے نام پر دوستوں کو احقوں اور حصہ داروں میں تقسیم ہو جاتا۔ ۲۵ر اکتوبر کے ایک خط میں مسٹر سانڈرس لکھتی ہیں: "شہر کا ہر ایک گھر ویران ہے اور ان میں سے کتنوں کو توڑ پھوڑ دیا گیا ہے۔ وسیع آبادی کے سب شہری شہر سے سات میل باہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اور بہر روز اشیائے خوردنی اور ٹھکانے کی عدم موجودگی میں موت کا شکار ہو رہے ہیں"۔

قتلِ عام اور منظم لوٹ کے علاوہ قہر کی نظر شہر کی عمارتوں پر پڑی۔ غدر سے پہلے لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان مکان ہی مکان تھے۔ سر بفلک عمارتیں تھیں جن میں شاہجہاں کے وقت سے امراء اور ان کے خاندان رہتے تھے۔ حکم ہوا کہ ان تمام مکانوں کو گرا دیا جائے۔ اس کے علاوہ اور متعدد محلے اور بڑے بڑے نامی بازار (خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار) کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا" ڈھا دیئے گئے۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے"۔ غالب ایک خط میں نواب انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"حضرت! انہدام مساکن و مساجد کا میں کیا حال گذارش کروں؟ بانی شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا جو اب والیان ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں۔ بلکہ قلعہ میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیئے گئے"

قلعہ کے اندر جو تباہی آئی۔ اس کا مرثیہ فرگسن کی تاریخ فن تعمیر ہندوستان

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۵) لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا تھا، لیکن پھر گرفتار ہوا اور پھانسی پا گیا۔ وغیرہ۔

جلد ثانی میں پڑھنا چاہیئے۔ لوٹ کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ ہر ایک نے دل کھول کر لوٹا۔

"When we took possession of the palace (i.e fort) every one seems to have looted after the most independent fashion."

یہ لوٹ مار صرف منتشر اشیا، مثلاً مال، زیور، برتن، کپڑوں اور دوسری املاک تک محدود نہیں رہی بلکہ بیدرد فاتحین نے تاریخی عمارتوں کی زیبائشیں اتارلیں یا سنگ مرمر سے نکال لیں۔ مثلاً ایک کیپٹن جیمز جونز صاحب بہادر تھے جو بعد کو سر جیمز جونز ہوئے، اُن کے حصے میں دیوان خاص کے چبوترے کی منبت کاری کا کچھ حصہ آیا۔ جو غالباً اطالوی سنگتراشوں کا کام تھا۔ انھوں نے اسے سنگ مرمر کی دو چھوٹی میزوں میں لگوالیا اور ان میزوں کو حکومت کے پاس پانچ پانچ ہزار میں بیچ دیا۔

مغل فن تعمیر کی قدر و قیمت جاننے والوں کے لیئے لوٹ سے بھی بڑا حادثہ انہدام تعمیرات تھا۔ اس شوق کی بھی دل کھول کر تسکین کی گئی۔ قلعہ کے اندر جو شاہجہاں کے وقت کا شاہی محل تھا۔ اور محلسرائے کے متعلقہ مکانات تھے ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔

"The whole of the HAREM courts of the palace were swept off the face of the earth to make way for a hideous barrack, without

those who carried out this fearful piece of vandalism thinking it worthwhile to make a plan of what they were destroying or preserving any record of the most splendid palace in the world."

یہ صحیح ہے کہ عام استعمال کی چند عمارتیں مثلاً دیوانِ خاص، رنگ محل (جسے گوروں کا دارالطعام بنا دیا گیا)، نوبت خانہ اور ایک دو چھوٹی چھوٹی اور عمارتیں قلعہ میں باقی رہنے دی گئیں لیکن چونکہ ان کو ملانے والے (corridors) اور (courts) ڈھا دیئے گئے اس لیئے نہ صرف ان منتشر عمارات کا وہ مقام و مفہوم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جو ایک ماہرِ فن معمار نے ایک منظم نقشے میں ان کے لیئے رکھا تھا۔ بلکہ ان کی اپنی خوبصورتی آدھی رہ گئی۔

قلعہ سے باہر انہدام عمارات میں جو اہتمام ہوا۔ اس کی کچھ تفاصیل ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔ ان کے علاوہ ایسی لاتعداد تاریخی عمارتیں تھیں جو منہدم نہ ہوئیں۔ لیکن عارضی یا مستقل طور پر ضبط کر لی گئیں ان میں سب سے شاندار جامع مسجد تھی جسے ایک گرجا میں منتقل کیئے جانے یا ایک پارک بنانے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔ پانچ سال تک یہ مسجد مسلمانوں کو واپس نہ ملی دوسری بڑی مسجد (فتح پوری) ایک دارالعلوم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا صحن تو واپس کیا گیا۔ لیکن ارد گرد کے احاطے اور حجروں کو نیلام کر دیا گیا اور کوئی بیس سال بعد دہلی دربار کے وقت لارڈ لٹن کے حکم سے ان چیزوں کو نئے ہندو مالک سے واپس لے کر مسلمانوں کو

بحال کیا گیا۔ وسیع اکبرآبادی مسجد جس میں شاہ عبدالعزیز صاحب درس دیتے تھے وہ تو اس وقت شہید ہو گئی۔ جب قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان سب عمارتیں ڈھا کر کھیل کا میدان بنایا گیا۔ زینت المساجد کا کچھ حصّہ مکان اور باقی حصّہ ایک بیکری میں تبدیل کیا گیا۔ اور لارڈ کرزن کے زمانے تک ستر سال یہ مسجد اسی حالت میں رہی۔

قتل۔ لوٹ اور انہدام عمارات سے بھی بڑا نقصان علمی اور تہذیبی تھا بیشمار علماء۔ فضلاء۔ شعراء حملہ آوروں کی گولی کا شکار ہوئے اُن سے زیادہ دلّی سے جان بچا کر بھاگے۔ لیکن شاید اس سے بھی بڑی تباہی یہ ہوئی کہ کتب خانے لٹ گئے۔ غالب کے خطوط میں بار بار نواب ضیاء الدین خاں کے وسیع کتبخانہ کا ذکر ہے۔ جس کی بربادی کے ساتھ غالب کی نظم و نثر کا کچھ حصّہ بھی ضائع ہو گیا۔ نواب صاحب والئ لوہارو کے بھائی تھے اور انہیں جاگیر سے جو کچھ ملتا تھا اسے وہ دغریب متعلقین کی سرپرستی کے علاوہ) کتابوں پر خرچ کرتے تھے۔ سرہنری ایلیٹ اور ان کے ساتھیوں نے آٹھ ضخیم اور مبسوط جلدوں میں اسلامی ہندوستان کی تواریخ کا انتخاب ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ بلا مبالغہ سینکڑوں کتابوں کا نچوڑ ہے برٹش میوزیم میں سرہنری ایلیٹ کے جو قلمی کاغذات ہیں وہ اس بات پر گواہ ہیں کہ اس کام میں انہیں سب سے زیادہ مدد نواب ضیاء الدین کے کتب خانہ سے ملی۔ اس تاریخی کتب خانہ کے متعلق غالب کا بیان پڑھیے "میرا ایک سبی بھائی ہے۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ "مجموعۂ نثر" اور "کلیاتِ نظم اردو" سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ کڈ ر کر

عرض کرتا ہوں۔ بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا۔ ایک ورق نہیں رہا"
یہی حال غالب کے ایک اور عزیز دوست اور شاہ دہلی کے موروثی ناظر حسین مرزا
کے کتب خانہ کا ہوا۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی ضیاء الدین صاحب اور
ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع
کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا"
دہلی میں اس وقت گھر گھر میں علمی خزانے تھے۔ لیکن شہر کے سب سے اہم کتب
خانے دو تھے۔ ایک خاندان ولی اللہ کا کتب خانہ۔ جس میں کتابیں جمع کرنے کا
کام تو شروع ہوا تھا۔ شاہ عبدالرحیم کے وقت سے، اور ان کے بیٹے مولانا
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس میں معتدبہ افزائش کی۔ پھر مولانا شاہ عبدالعزیز
کے زمانے میں تو وہ ایک منظم اور باقاعدہ کتب خانہ ہو گیا۔ بہت زیادہ افزائش
و ترقی کے ساتھ"۔ مذہبی کتب کا سب سے بڑا ذخیرہ اس جگہ تھا۔ اگرچہ خاندان
شیخ عبدالحق محدث خانوادۂ خواجہ میر درد اور کئی دوسرے بزرگوں کے کتب خانے
بھی بے نظیر تھے۔ لیکن قیمتی تاریخی کتب۔ دواوین اور تصاویر کا سب سے
قیمتی خزانہ تھا "شاہی کتب خانہ قلعہ کا جس میں سینکڑوں برس بلکہ آغاز عملداری
اسلامی سے کتابوں کا ذخیرہ برابر جمع ہوتا آتا تھا"۔ اور جو اب ایک پبلک نیشنل لائبریری
کی حیثیت اختیار کرتا جاتا تھا۔ اور جہاں سے قابل اعتماد علماء عاریتاً کتابیں حاصل

لے ملاحظہ ہو کتاب "الحیات بعد الممات" (سوانح عمر حافظ نذیر حسین
صاحب محدث صفحہ ۶۵)

کرسکتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ بوقت ضرورت قلعہ کے کتب خانہ سے مذہبی کتابیں منگایا کرتے تھے اور شمس العلماء، میاں نذیر حسین صاحب محدث کی سوانح عمری الحیات بعد الممات میں بھی لکھا ہے" بسبب اس کے کہ مرزا فخر الدین ولی عہد بہادر شاہ سے اور میاں صاحب سے نہایت ربط تھا۔ قلعہ کے کتب خانہ میں انہیں پورا اقتدار حاصل تھا۔ قلعہ میں رہ کر بھی کتابیں پڑھتے تھے اور کتب خانہ سے گھر پہ کتابیں لے جا کر مطالعہ کرتے (صفحہ ۶۵)

قلعہ شاہی کے کتب خانہ کی تباہی اس زمانے کا سب سے بڑا علمی حادثہ ہے۔ اس سے نہ صرف قوم کی علمی روایات کا تسلسل درہم برہم ہو گیا۔ بلکہ نادر تصاویر اور قیمتی کتب کا وہ ذخیرہ جس کے ہمپایہ ذخیرے دنیا بھر میں بہت تھوڑے ہوں گے۔ اس طرح تباہ و منتشر ہوا کہ آج ان چیزوں کا سراغ لگانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ نام نہاد" فاتحین دہلی کی جہالت و بربریت کا سب سے اندوہناک مظاہرہ شاہی کتب خانہ کے بارے میں ہوا۔ ان سے پہلے بھی، ان کے اپنے ہموطنوں نے دارالحکومتوں پر قبضہ کیا تھا۔ مثلاً سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کا کتب خانہ تھا اس کے بیش قیمت اجزاء لندن گئے (اور اب انڈیا آفس کی زینت ہیں)، باقی سے ایشیا سوسائٹی آف بنگال کے وسیع مشرقی کتبخانہ کی بنیاد استوار ہوئی۔ بہرکیف کتابیں محفوظ تو رہیں۔ اور منتشر ہونے سے بچ گئیں لیکن فاتحین دہلی نے بدرجہا وسیع اور قیمتی کتب خانے کو لوٹنے والوں کے حوالے کر دیا اور تمام کتب خانہ تتر بتر ہو گیا۔ اب کوئی کتاب انڈیا آفس میں ہے۔ تو کوئی خدابخش لائبریری میں اور کسی شاہی البم کے دس ورق برلین میں ہیں۔ تو

بارہ لندن میں۔ اور چھ پیرس میں اور یہ سب ملا کر اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔

مرزا غالب سے باز پرس

مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے مرزا کا گھر تو لوٹ سے محفوظ رہا، لیکن جو زیورات اور قیمتی چیزیں ان کے گھر سے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوا دی گئی تھیں۔ وہ فتحمند فوج نے کھود نکالیں۔ علاوہ ازیں دستنبو سے پتہ چلتا ہے کہ سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے ۵ راکتوبر کو دیوار پھاند کر مرزا کے محلے میں آ داخل ہوئے۔ اور انھوں نے دوسرے چھوٹے چھوٹے گھروں کو چھوڑ کر غالب کے گھر کا رُخ کیا۔ مرزا کا بیان ہے کہ انھوں نے مال و اسباب کو نہیں چھوا۔ البتہ مرزا، عارف کے دو بچوں اور چند ہمسایوں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی میں کرنیل براؤن[1] کے سامنے لے گئے۔ جہاں چند سوال وجواب ہوئے اور مرزا کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ اس واقعہ کی نسبت نواب غلام حسین خاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کر کے لے گئے اور کرنل براؤن صاحب کے سامنے لے جاکر اُن کو پیش کیا۔ مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ اُن کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوائی۔"

---

[1] غالب نے فوجی افسر کا نام براؤن لکھا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود کی تحقیق ہے کہ اصل نام برآن تھا۔

مرزا کی گرفتاری اور بازپرس کوئی دل لگی کی بات نہ تھی، لیکن اس موقعہ پر بھی ان کی طبعی ظرافت نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور شاید اسی نے ان کی جان بچائی۔

لطیفہ:۔ جب مرزا کو گورے گرفتار کرکے لوگ لے گئے تو انگریز سارجنٹ نے جو راستے میں شامل ہوگیا۔ یا تو مرزا کی انوکھی وضع دیکھ کر یا اس خیال سے کہ ابھی شہر میں کسی مسلمان کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔ مرزا سے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو؟ مرزا نے ہنس کر جواب دیا کہ آدھا مسلمان ہوں۔ وہ متحیّر ہوکر کہنے لگا۔ کرویل صاحب! آدھا مسلمان کیسا؟ مرزا بولے۔ "صاحب: شراب پیتا ہوں، ہیم ہوک (سور) نہیں کھاتا۔

کرنیل براؤن صاحب سے مرزا کے جو سوال وجواب ہوئے ان میں بھی انکی بذلہ سنجی نمایاں تھی۔ کرنیل صاحب کو مرزا نے ملکہ معظّمہ سے اپنی خطاب وخلعت کے متعلق خط وکتابت دکھائی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ تو انھوں نے پوچھا کہ تم دہلی کی لڑائی کے وقت پہاڑی (Ridge) پر کیوں نہیں آئے۔ جہاں انگریزی فوجیں اور ان کے طرفدار جمع ہو رہے تھے۔ مرزا کہنے لگے:۔

"تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے، میں کیونکر آتا اگر کچھ فریب کرکے کوئی بات کرکے نکل جاتا۔ جب پہاڑی کے قریب گولی کی زد پر پہنچتا تو پہرے والا گورا مجھے گولی ماردیتا۔ یہ بھی مانا کہ تلنگے باہر جانے دیتے۔ گورے گولی نہ مارتے۔ میری صورت کو دیکھیئے اور میرا

حال معلوم کیجیئے۔ بوڑھا ہوں۔ پاؤں سے اپاہج اور کانوں سے بہرا نہ لڑائی کے لائق نہ مشورت کے قابل۔ ہاں دعا کرتا ہوں، سو یہاں بھی دعا کرتا رہا"

کرنیل صاحب ہنسے۔ اور مرزا کو ان کے نوکروں اور علاقہ داروں کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی۔

مرزا یوسف کی وفات

مرزا تو سخت جان تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں اور بچ نکلے لیکن انکے بھائی مرزا یوسف اس قدر خوش قسمت نہ تھے۔ ان کا تیس برس کی عمر سے دماغ خراب تھا اور غالب کے مکان سے دور ایک علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ جس قدر موروثی پنشن مرزا کو سرکاری خزانے سے ملتی تھی اسی قدر مرزا یوسف کیلئے مقرر تھی۔ ان کی بیوی اور بچے انکے ساتھ رہتے تھے لیکن جب دلی فتح ہوئی تو قیامت کی طرح نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ان کی بیوی اور بچے انھیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ گھر پر اُن کے پاس ایک بوڑھی نوکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گئے۔ مرزا کو بھی اطلاع ملی لیکن بے بس تھے۔ ایسی حالت میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔

"کس فرستادن و آں سہ تن و کالا را بدینجا آوردن، اگر جادو دانستمے نتوانستمے"

۳۰ر ستمبر کو جب مرزا کو اپنا دروازہ بند کیئے ہوئے بندرہ سولہ دن ہو رہے تھے۔ انہیں اطلاع ملی۔ کہ فوجی مرزا یوسف کے گھر آئے اور سب کچھ لے گئے لیکن انہیں اور بوڑھے نوکروں کو زندہ چھوڑ گئے۔

؎ غالب نے سرجان میکلوڈ کے لیئے اپنی نظم و نثر کا مختصر انتخاب مرتب کیا تھا (انتخاب غالب) یہ تمام تفصیلات اس میں دی ہیں۔

مرزا معین الدین جو غالب کے قریبی رشتہ دار تھے، غدر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ مرزا اسداللہ خاں کا بھائی مرزا یوسف خاں جو عرصے سے مخبوط الحواس تھا۔ گولی کی آواز سنکر یہ دیکھنے کہ کیا ہو رہا ہے گھر سے باہر آیا اور مارا گیا۔ لیکن مرزا کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹ اکتوبر کو صبح کے وقت مرزا یوسف کا بوڑھا دربان آیا اور خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گذر گیا۔

مرزا کی حالت اس وقت قابلِ رحم تھی۔ ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ نہ کفن کے لیئے کپڑا ملتا تھا۔ نہ مردہ نہلانے کے لیئے مردہ شو۔ اور نہ قبر کھودنے کے لیئے گورکن۔ اس کے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گذر گیا تھا۔ شہر میں دو تین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا ہی ناممکن تھا۔ شہر سے باہر میت لے جانے کی ہمت کسے پڑتی۔ لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بے کسی پر رحم کیا اور تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے چلا۔ مرزا کے دو نوکروں کو ساتھ لے کر میت کو نہلایا۔ اور گھر سے جو دو تین چادریں لے گئے تھے ان میں لپیٹ کر قریب کی ایک مسجد میں مرزا یوسف کو دفن کیا۔ دستنبو سے یہ امر واضح نہیں ہوتا کہ بھائی کی تدفین کے وقت مرزا موجود تھے یا نہیں لیکن اگر وہ تھے بھی اور نماز جنازہ کا بھی کسی طرح انتظام ہو گیا۔ تب بھی مرزا یوسف کا انجام اُن کی زندگی سے کم حسرتناک نہیں معلوم ہوتا ہے

دریغ آنکہ اندر درنگِ نشیبست سنہ ذہ شادوسی سال ناشاد زیست،

نہ خاکِ بالیں زخشتش نبود! بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا بریں مردہ بخشا نشے کہ نادیدہ در زیست آسانشے

حکیم محمود خاں

فتح دہلی کے بعد جو افراتفری مچی، وہ ایک دو مہینے میں ختم نہیں ہوگئی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہوا تھا۔ لیکن مرزا فروری ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں کہ ابھی تنگ وہی حالت ہے۔ دن کی بے قراری اور رات کی بے خوابی برقرار ہے۔ اور اطمینان بھی کیسے ہوتا جبکہ مخبریوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ چنانچہ دوم فروری کو حاکم شہر چند سپاہیوں کے ساتھ غالب کے محلہ میں آیا اور حکیم محمود خاں کو جن کی موجودگی سے غالب اور دوسرے لوگوں کو بڑا سہارا تھا۔ ساٹھ آدمیوں سمیت اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ زیر حراست رہے۔ لیکن بقول غالب آبرو والوں کی آبرو کا بھی خیال رکھا گیا۔ حکیم محمود خاں اور چند دوسرے معززین کو تو تین روز کے بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی اور چند آدمی ایک ہفتہ کے بعد رہا ہوئے۔ لیکن نصف سے زیادہ لوگ وہیں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانے میں غالب کی جائے پناہ حکیم محمود خاں کا دروازہ تھا۔ شہر کے اور کئی معززین نے بھی حکیم صاحب کے ہاں پناہ لی تھی۔ اور حاکم شہر کے پاس کسی نے ان لوگوں کے خلاف مخبری کی۔ لیکن حکیم صاحب ان لوگوں کی بے گناہی کے قائل تھے اور مہاراجہ پٹیالہ سے تعلقات کی وجہ سے جو کچھ ان کا اثر تھا وہ انہوں نے بے گناہوں کو بچانے کے لیئے صرف کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۸ء میں باقی لوگ بھی رہا ہوگئے۔ حکیم محمود خاں کی یہی عالی ہمتی تھی جس کے متعلق حالی نے

مرثیۂ محمود خاں میں لکھا ہے ؎

وہ زمانہ جبکہ تھا دلی میں ایک محشر بپا　　نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا　　باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا
موجزن تھا جبکہ دریائے عتاب ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال
دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار　　ساتھ دیتا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار　　شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار
آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک و تر
مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ　　عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ　　پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ
ایسے نازک وقت میں مردانگی اُس نے جو کی
اہل انصاف اسکو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی
بالیقیں جن ملزموں کو اُس نے سمجھا بے خطا　　مارشل لا میں ثبوت اُنکی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا　　جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت برملا
زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

مرزا کے احباب

مرزا نے دستنبو میں اپنے دوسرے دوستوں کی سرگذشت لکھی ہے۔ نواب ضیاء الدین اور نواب امین الدین جب

ہفتے شہر فتح ہوا تھا۔ اسی ہفتے اہل و عیال اور چند آدمیوں کے ساتھ اپنی جاگیر لوہارو جانے کے لیئے روانہ ہوئے لیکن ابھی مہرولی ہی میں تھے۔ کہ لٹیرے سپاہیوں نے گھیرا۔ اور بدن پر جو کپڑے تھے اُن کے سوا سب کچھ لے گئے۔ دہلی میں جو اُن کے گھر پہ گذری وہ اس سے بڑھ کر تھی۔

"اینجا در خانہ و کاشانہ زکاخ و کلوخ ہر چہ بود بتاراج رفت۔ نہ از گمینہ و زرینہ نام و نشان ماند و نہ از گستردنی و پوشیدنی باندازۂ تار موئے درمیان ماند"

مظفر الدین حیدر خاں اور ذو الفقار الدین حیدر خاں (حسین مرزا) پر جو گذری وہ اس سے بھی دردناک تھی۔ وہ شہر کے باقی معزز لوگوں کی طرح اپنے شاندار اور پُرشکوہ مکان چھوڑ کر جان بچا کر بھاگ نکلے تھے جس طرح شہر میں اور گھر لٹے گئے۔ ان کے گھر میں بھی جھاڑو دی گئی لیکن اوروں کے ہاں مکان تو سلامت رہے۔ یہاں کسی نے مکان کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگا دی۔ چنانچہ لکڑی اور پتھر اور در و دیوار سب جل کر راکھ ہو گئے۔ نواب ضیا ءالدین اور حسین مرزا کو جو مصیبتیں پیش آئیں۔ بہت دردناک تھیں۔ لیکن ایک خاص طور پر قابل افسوس بات یہ ہے کہ ان کے کتب خانوں کی تباہی سے مرزا کا وہ کلام ضائع ہو گیا۔ جو ان کے ہاں جمع ہوتا تھا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں مرزا نے اپنے اُردو کلام کا ایک نسخہ رامپور بھیجا تھا۔ وہ تو سلامت رہا اور اس کی نقلوں سے ۱۸۶۱ء میں موجودہ اردو دیوان تیار ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر مرزا نے اس کی نقل بھیجنے کے بعد کوئی اور اردو اشعار لکھے تو وہ اس میں موجود نہ ہوں گے۔ اسی طرح کئی فارسی خطوط اور

شاید اشعار بھی ضائع ہوئے ہوں۔ مرزا ایک اردو خط میں لکھتے ہیں: "پنج آہنگ نامکمل ہے اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

مندرجہ بالا واقعات تو دستنبو سے ماخوذ ہیں لیکن مرزا نے اردو رقعات میں اپنے دوستوں کو اس پُر آشوب زمانے میں جو کچھ گذری اس کی داستان قدرے تفصیل سے لکھی ہے۔ اور چونکہ مرزا کے یہ دوست ایوانِ ادب کے شاندار ستون بھی تھے۔ ہم ان کے حالات مرزا کے خطوط سے انتخاب کر کے درج کرتے ہیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو غدر کے بعد سات سال قید کا حکم ہوا تھا۔ وہ ایک معزز جاگیردار اور اردو فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اور اردو شعرا کا جو تذکرہ فارسی زبان میں انھوں نے گلشنِ بے خار کے نام سے لکھا ہے اس کے صفحے صفحے سے اُن کا پاکیزہ ادبی مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے آزاد کی طرح واقعات کو نمک مرچ لگا کے پیش نہیں کیا۔ اس لئے ان کا تذکرہ خواص کی آنکھ کی عینک ہے۔ آبِ حیات کی شہرتِ عامہ اسے حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کے مختصر فقرے بلاغت کی جان ہیں۔ اور جب اس تذکرے میں اُن کی میانہ روی اور انصاف پسندی جس کا گارسن دتاسی بہت مداح تھا، دیکھتے ہیں تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ حالی کیوں کہتا تھا کہ میں نے غالب سے بہت کم سیکھا ہے اور میری تحریر کی سادگی اور سچائی اور صحیح ادبی مذاق کچھ تو طبعی تھا اور بیشتر شیفتہ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ۔ مرزا نواب کی نثر و شاعری اور مذاقِ شعر کے مداح تھے۔ اس کے علاوہ جو مہربانیاں ان پر قید کے دوران میں نواب نے کی تھیں وہ بھی بھولی نہ ہوں گی۔ چنانچہ ان کی مصیبت دل پر گہرا زخم تھا۔ ایک خط میں

لکھتے ہیں :-

"مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے
ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں "

جب نواب کی اپیل کامیاب ہوئی اور وہ رہا ہوئے تو مرزا اپنی بے دست و پائی کے باوجود بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گئے۔ اُن سے ملے۔ اور چار دن کے قیام کے بعد واپس آئے۔

مولینا مفتی صدرالدین آزردہ جو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ غدر سے پہلے دلی میں صدرالصدور تھے۔ لیکن اس کے باوجود محفوظ نہیں رہے۔ مرزا ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"حضرت جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے
کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ رُوبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی
کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے فنانشل کمشنر
اور لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی اب
نصف جائداد پر قابض ہیں "

سب سے حسرتناک انجام مولوی فضل حق خیرآبادی کا ہوا جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت کے اس لیے بھی یاد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالب کو بیدلؔ کی تقلید سے روکا اور اس کی ادبی تربیت کے لیے ایک اُستادِ کامل ثابت ہوئے جو بقول میر تقی میرؔ مرزا کی شاعری کی نشو ونما کے لیے ضروری تھا۔ غالباً انہیں کی نسبت یوسف مرزا کے نام ایک اردو خط میں لکھا ہے :-

"مولینا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوامِ حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو ..... ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا ہو لیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔"

مولانا دہلی سے جلاوطن ہو گئے۔ لیکن مرزا کے دل سے کیسے فراموش ہوتے؟ وہ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں منشی دادخاں سیاح کو لکھتے ہیں:-

"ہاں خاں صاحب۔ آپ جو کلکتے پہونچے اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی۔ اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ کس طرح گذارا ہوتا ہے ۔"

داستانِ تاریخ اردو میں لکھا ہے کہ مولانا کے فرزندِ ثانی اور منشی غلام غوث بے خبر کی کوششوں سے رہائی کا حکم صادر ہوا تھا۔ لیکن جس وقت پروانہ آزادی رنگون پہنچا۔ اس وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں وفات پائی اور رنگون میں سپردِ خاک ہوئے۔

مرزا کے ہندو دوست

مرزا خود تو ان مصائب سے محفوظ رہے لیکن اُن کے لئے بھی یہ وقت قیامت کی گھڑی سے کم نہ تھا۔ ایک تو اپنا مستقبل تیرہ و تاریک۔ پھر اتنے دوستوں کا غم۔ بھائی کی موت کا صدمہ۔ اس کے علاوہ اگرچہ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے گھر سے کوئی چیز چھینی نہ گئی، لیکن ان کی تمام قیمتی چیزیں جو ان کی بیوی نے حفاظت کے لئے کالے شاہ

صاحب کے تہ خانے میں بھجوادی تھیں۔ وہاں سے فاتحین نے لوٹ لیں۔ مرزا لکھتے ہیں کہ قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ پہننے اور بچھونے کے علاوہ اور کوئی چیز گھر میں نہیں رہی۔ چنانچہ وہ اوڑھنے پہننے کے کپڑے بیچ بیچ کر پیٹ بھرتے رہے۔ "بفروختن آں گستردنی و پوشیدنی جان و تن ہمی پروردم۔ گوئی کہ دیگراں نان خورند ومن جامہ ہمے خورم۔" لیکن یکم جنوری ۱۸۵۸ء سے شہر میں ہندوؤں کی آباد کا حکم ہو چکا تھا۔ اور مرزا کے ہندو شاگردوں اور دوستوں نے ان کی اس مصیبت کے وقت میں بڑی مدد کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ آگرے سے روپے اور کپڑے بھیجتے رہے شراب جو اُن کے لیے نان خورونی سے بھی زیادہ ضروری تھی مہیش داس مہیا کرتے تھے۔ اور اُن کی تنہائی میں ہیرا سنگھ، شوجی رام اور بالمکند غمگساری اور خدمت گاری کے لیے حاضر تھے، لیکن مرزا کا ہاتھ خرچ کے معاملے میں ہمیشہ آزاد رہا تھا۔ اُن کی مالی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ اور چونکہ مستقبل کی نسبت ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا اس لیے دستنبو کا آخری حصہ جسے انھوں نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کو ختم کیا نہایت مایوسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سابق پنشن اگر مل گئی تب بھی کچھ نہیں بنے گا۔ اور دلی تو قصہ ہی پاک ہے۔

"کہن پنشن اگر بدست آید، بنر زنگ از آئینہ نے زداید۔ اگر فراچنگ
نیاید، مرا آبگینہ جز سنگ نیاید۔"

دہلی مرحوم

غالب کے خطوط دلی کی بربادی کی داستان سے پُر ہیں۔ فتح دلی کے بعد اہالیانِ شہر کی جس طرح جانکنی شروع ہوئی تھی اس کے متعلق اردوئے معلّیٰ میں ایک قطعہ ہے ؎

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے، زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

اس قطعہ میں تو انسانوں کی مشکلات و مصائب کا بیان ہے لیکن مہینوں کی لوٹ۔ قتل و غارت۔ بربادی و آشفتگی کے بعد مرزا کا محبوب شاہجہاں آباد جس طرح ختم ہو گیا اس کے متعلق ایک اردو خط میں کہتے ہیں:-

"کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں ہوں گے۔

اے میری جان! یہ وہ دہلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ وہ دلّی نہیں جس میں تم نے تحصیل علم کیا۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم سبحان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان، اہل حرفہ، یا حکّام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ

روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جوانیں کسبنیاں امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا۔ سو روپے روز کا روزینہ دار سو روپیہ مہینہ کا پنشن خوار ہو کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیر کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی رہ چکا ہے بیمار پڑا۔ نہ غذا، نہ دوا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی، حیا کو دیکھو۔ ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اس کے پاس پیسہ نہیں ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچکر، نوش جان کر کے بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں ہنرمند آدمی یہاں کیونکر پایا جائے۔"

اسی طرح کے کئی خط میر مہدی مجروح کے نام ہیں۔ مثلاً

"ارے میری مہدی۔ تجھے شرم نہیں آتی ع

میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے

ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں، یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں، گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں

کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں
پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد
ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ
تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں
وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے..... قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا اور
اب جو کنوئیں جاتے رہے پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔
اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔ واہ رے
حسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلی کہاں؟
واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔"

دہلی کی بربادی کے داغ اور دوسرے شاعروں نے شہر آشوب لکھے لیکن
غالب کے خطوں میں اس بربادی کی جو تصویر ہے۔ کہیں اور نہیں اور نہ صرف نثر
نگاری کا شاہکار ہے۔ بلکہ اس لائق ہے کہ ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ پر
تاریخ داں غور کرتے۔ غالب کے بعد یہ مضمون اس کے شاگرد حالی کا ہو گیا۔ اس
کے چند اشعار پر ہم یہ اندوہناک باب ختم کرتے ہیں:۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ۔۔۔ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہر گز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل ۔۔۔ ہنستے ہنستے، ہمیں ظالم نہ رلانا ہر گز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی ۔۔۔ کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہر گز
لے کے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح ۔۔۔ دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہر گز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک ۔۔۔ دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہر گز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے — ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز
جن کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں — نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دہلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

طوفان کے بعد سکون

پنشن کی بازیابی

غدر کے بعد جب مرزا کو جان کی سلامتی کا یقین ہوا تو انہیں پنشن کی فکر ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حکام عالیشان کی تعریف میں قصائد لکھ کر حکام دہلی کی معرفت ارسال کیے لیکن ۱۷ مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ ان میں سوائے ستائش و مدح کے کچھ نہیں۔ جب اس سے کچھ مہینے بعد اکتوبر میں دستنبو چھپی تو مرزا نے چند جلدیں نہایت محنت سے مجلد کروا کے دو ولایت اور چار ہندوستان میں حکام اعلیٰ کی نذر کیں، معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب حکام کی نظر میں مقبول ہوئی۔ چنانچہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم یو۔پی نے بہت تعریف لکھی۔ اور مسٹر میکلوڈ فنانشل کمشنر نے خط لکھ کر کمشنر دہلی کی معرفت یہ کتاب مرزا سے منگائی، لیکن اس قدردانی کے باوجود حکام کا دل اُن سے صاف نہ ہوا۔ اور جب جنوری ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں بڑا دربار ہوا اور سب درباری بلائے گئے۔ تو مرزا کو وہاں مدعو نہ کیا گیا۔ پھر جب گورنر جنرل کا کیمپ میرٹھ سے دہلی آیا اور مرزا نے چیف سکریٹری کے خیمہ

میں ملاقات کے لئے اپنا ٹکٹ بھجوایا - تو وہاں سے جواب ملا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے[1]۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو لارڈ کیننگ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا تھا ؎

زسالِ نود گر آبے بروئے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

وہ بھی معہ اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔

مرزا کی پنشن کے متعلق شروع ۱۸۵۹ء میں حوصلہ افزا تحقیقات ہوئی تھی اور انہیں ایک سو روپیہ بطریق امداد بھی ملا تھا۔ لیکن اب جو انہیں دربار کے متعلق یہ جواب ملا۔ وہ پنشن سے بھی مایوس ہو گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

۳۰ ، ۵ برس کا پنشن۔ تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و بہ منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا' خیر احتمال ہے ملنے کا علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا' اس وقت کلّو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں، بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔"

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے متعلق خیال تھا کہ غدر میں انھوں نے بہادر شاہ کی خود مختارانہ تخت نشینی پر سکہ لکھا تھا۔ یہ خیال غالباً غلط تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران میں غالب کے تعلقات بہادر شاہ سے منقطع نہیں ہوئے تھے۔ اور آگرے کے اخبار آفتاب عالمتاب میں لکھا ہے کہ مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے (مرزا کا یہ قصیدہ ان کے دیوان میں نہیں)

جب مرزا کی حالت بالکل نازک ہوگئی۔ زیور کپڑے بک گئے اور قرض ملنا بند ہو گیا تو وہ سخت اقدامات پر مجبور ہو گئے، انہیں سب سے زیادہ خیال اہل وعیال کا تھا۔ جن کی خاطر بڑا سلسلہ قائم رکھنا پڑتا تھا۔ جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے اور شاید خارجی مشکلات نے خانگی بدمزگی بھی پیدا کر دی۔ تو مرزا نے دہلی سے باہر جانے کا ارادہ کیا اور اپنی بیوی کے رشتہ داروں سے کہا کہ وہ اس کی بیوی اور اس کے بھانجے عارف کے بچوں کی جنہیں وہ پال رہی تھی، نگہداشت کا انتظام کریں۔ ایک خط میں نواب امین الدین احمد خاں، رئیس لوہارو کے صاحبزادے مرزا علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:۔

"اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدہ ماجدہ سے اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں۔ انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے، پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی چاہا وہاں گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔"

مرزا کا ارادہ تھا کہ وہ خود پٹیالہ جا کر مہاراجہ نرندر سنگھ کے دربار میں قسمت آزمائی کریں۔ غالباً اس ارادے میں حکیم محمود خاں کے دو بھائیوں کے مشورے کو دخل تھا۔ وہ پٹیالہ میں شاہی طبیب تھے۔ لیکن چونکہ ان کا آبائی مکان مرزا کے مکان سے ملحق تھا۔ ان کے مرزا سے گہرے تعلقات تھے، مرزا نے اس زمانے میں مہاراجہ پٹیالہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ لیکن بعض وجوہ سے

یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"بھائی! میرا دکھ سنو، ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے، ایک تنہائی سے نفور رہے۔ ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور وقت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولتِ تنہائی میسر آجاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی"

اس زمانے میں مرزا نے مہاراجہ الور کی تعریف میں قصیدہ لکھا۔ اور مدد چاہی۔ لیکن جب ادھر سے کچھ نہ حاصل ہوا۔ تو انھوں نے رام پور کا رُخ کیا۔ نواب یوسف علی خاں صاحب رئیس رام پور ۱۸۵۷ء سے اُن کے شاگرد تھے اور گاہے گاہے کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ غدر کے بعد مرزا کی حالت خراب ہوئی۔ نواب کی طرف سے ایک سو روپیہ ماہانہ اُن کی مدد کے لیئے جولائی ۱۸۵۹ء کے وسط سے مقرر ہوگیا تھا اب جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا کو حکام انگریزی کی طرف سے بڑا خشک بلکہ ترش جواب ملا۔ تو وہ رامپور گئے وہاں نواب نے ان کی بہت توقیر کی۔ اور مدد معاش کے متعلق وعدہ کیا۔ کہ اگر مرزا رام پور رہیں تو دو سو روپے ماہوار پائیں۔ اور اگر دلی رہیں تو ایک سو۔ لیکن مرزا عارف کے دو بچوں کو ساتھ لے گئے تھے، وہ رامپور میں گھبرا گئے۔ اس لیئے مرزا ڈیڑھ دو مہینے کے قیام کے بعد اخیر مارچ میں دہلی واپس لوٹے۔

مرزا کا خیال تھا کہ نواب کی وساطت سے حکام سے صفائی ہوجائے گی اور پنشن کا قضیہ طے ہوجائے گا۔ اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی لیکن نواب کا مرزا

سے جو مربیانہ تعلق تھا وہ سفر رامپور سے اور مستحکم ہو گیا۔ اس کے علاوہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس سفر سے ہی پنشن کا راستہ کھل گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان ہے کہ سر سید نے غالب کی پنشن کے لیئے بڑی کوشش کی تھی۔ (الہلال مورخہ ۱۷ جون سنہ ۱۹۱۲ء) قرائن سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مرزا نے بالوضاحت لکھا ہے کہ پنشن کی بازیابی میں نواب رام پور کو کچھ دخل نہ تھا (خطوط غالب مرتبہ مہر جلد دوم صفحہ ۱۱۸) اور چونکہ ان کی کوشش کے باقی سب ذریعے ناکام ہو چکے تھے اور حاکم دہلی نے بھی رپورٹ ان کے خلاف بھیجی تھی۔ اس لیئے پنشن کے اجراء میں کسی ایسی کوشش کو دخل ہوگا جس کا مرزا کسی مصلحت کی بنا پر ذکر نہیں کرنا چاہتے اور "یہ کام خداساز ہے۔" بعلی ابن ابی طالب علیہ السلام کہہ کر ٹالا ہے۔ حیات جاوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب سنہ ۱۸۶۰ء میں نواب رامپور سے ملنے کے بعد مرزا واپسی پر مراد آباد ٹھہرے تو سر سید، جو ان دنوں وہاں صدر الصدور تھے، انہیں آکر سرائے سے اپنے مکان پر لے گئے۔ قرین قیاس ہے کہ اس قیام کے دوران میں مرزا نے اپنے مصائب کا حال بیان کیا ہو اور سر سید نے انہیں دور کرنے کے لیئے وہ اثر و رسوخ جو انہیں غدر کے بعد حاصل ہو گیا تھا، استعمال کیا ہو۔ خواہ سر سید کی سرکاری ملازمت یا کسی اور مصلحت کی بنا پر ان کوششوں کا ذکر مناسب نہ سمجھا گیا ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان اس لیئے بھی قرین قیاس ہے۔ کہ غالب سر سید کے ہاں مارچ سنہ ۱۸۶۰ء میں قیام پذیر ہوئے اور پنشن کا اجراء اس کے چند ماہ بعد یعنی مئی سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوا چنانچہ انھوں نے ۶ مئی کو جو خط منشی ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا ہے اس میں تین برس کا زر مجتمع، دو ہزار دو سو

پچاس روپے پائے اور اس کی ادائیگی قرضہ میں خرچ ہوجانے کی تفصیل درج ہے۔ مرزا کی پنشن موروثی تھی۔ اس لیئے اب وہ باقاعدہ ملنی شروع ہوگئی لیکن چونکہ ان کی وفاداری کی نسبت حکام کے دل میں شبہات باقی تھے اس لیئے ان کا درباری اعزاز اور خلعت جو گورنر جنرل کا عطیہ تھے بحال نہ ہوئے۔ مرزا کو اس کا بہت رنج تھا۔ لیکن مارچ ۱۸۶۳ء میں حکام نے یہ شکایت بھی رفع کر دی۔ چنانچہ مرزا خان بہادر منشی غلام غوث بے خبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ "تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے" متحیرانہ میں نے پوچھا کہ "حضرت کیونکر" حضرت نے کہا کہ "حاکم حال نے ولایت سے واپس آ کر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے ہیں اور با جلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے"

چنانچہ سر رابرٹ منٹگمری لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ۲۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا کو بلا کر انہیں خلعت عطا کیا۔

دربار رامپور سے مرزا کے تعلقات

ہم نواب یوسف علیخاں صاحب اور مرزا کے تعلقات کا ضمناً ذکر کر چکے ہیں، لیکن چونکہ مرزا کے آخری ایام میں ان تعلقات کی اہمیت بہت

زیادہ تھی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے۔
۱۷۹۴ء میں نواب سید غلام محمد خاں رامپور میں مسند نشین ہوئے، لیکن حکومت اودھ نے اس کی مخالفت کی اور نواب صاحب اور اُن کی اولاد کو رامپور چھوڑنا پڑا۔ رامپور چھوڑنے کے بعد یہ حضرات دہلی مقیم ہوئے جہاں مرزا غالب کے اس خاندان کے کئی افراد سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مرزا جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک فارسی خط میں والئے رامپور کو ان تعلقات کی یاد دلاتے ہیں اور نواب صاحب کے ایک قرابت دار کی جو دہلی آکر مرزا سے نہیں ملے دبے لفظوں میں شکایت کرتے ہیں:۔

"ہم دریں گنج کہ مسکن من است شنیدہ ام کہ والا شان زین العابدین خان بہادر بشہر آمدہ آمد۔ نیازمندیٔ من با مرحومی نواب عبداللہ خاں بہادر و مہرورزئے من با اصغر علی خاں مرحوم و محبت و خلعت من با نواب عبدالرحمٰن خاں بہادر مغفور کجا دیدہ اند و آں مدارج کے در نظر دارند کہ ایشاں را در ضمیر میگذشت کہ گدائے گوشہ نشیں را باید دید"

مرزا نے اس خط میں جن حضرات کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سے نواب عبداللہ خاں اور نواب عبدالرحمٰن خاں، نواب یوسف علی خاں کے چچا تھے۔ اور سید اصغر علی خاں نواب عبداللہ خاں کے صاحبزادے۔ مرزا کی خوش قسمتی تھی کہ نہ صرف ان برگزیدہ حضرات سے ان کی دوستی ہو گئی۔ بلکہ اس بچھڑے ہوئے قافلے کا وہ فرد عزیز، جو آگے چل کر رامپور میں مسند نشین ہونے والا تھا۔ ان کے حلقۂ شاگردی میں آیا۔

نواب یوسف علی خاں ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے اور چونکہ اس وقت ان کے والد نواب محمد سعید خاں ابن نواب غلام محمد خاں دہلی میں اقامت گزیں تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ عربی انھوں نے مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی اور فارسی مرزا غالب اور خلیفہ غیاث الدین مصنف غیاث اللغات سے۔

نواب غلام محمد خاں اور ان کی اولاد کو رامپور چھوڑے پچاس سال نہ ہوئے ہوں گے۔ کہ ۱۸۴۰ء میں نواب سید احمد علی خاں والیئے رامپور نے وفات پائی اور حکومتِ انگلشیہ نے ان کا جانشین نواب غلام محمد خاں کے صاحبزادے نواب محمد سعید خاں کو منتخب کیا۔ اس موقع پر نواب صاحب کے بھائی اور مرزا کے قدیمی دوست نواب عبداللہ خاں نے مرزا سے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی لیکن یا تو مرزا کو ابھی تک شاہانِ دہلی و اودھ اور حکام انگریزی کے علاوہ کسی دوسرے کی تعریف میں مدحیہ قصیدہ لکھنا پسند نہ تھا۔ یا ان دنوں کسی خاص پریشانی میں مبتلا تھے۔ انھوں نے یہ لکھ کر کہ میں زندہ نہیں۔ مردہ ہوں۔ اپنی پریشان خیالی کا عذر کیا اور مدح گوئی سے معذرت چاہی۔

نواب یوسف علیخاں فردوس مکاں

نواب سید محمد سعید خاں نے ۱۸۵۵ء میں وفات پائی اور ان کی جگہ نواب سید محمد یوسف علیخاں تخت نشین ہوئے۔ مرزا نے اس موقع پر ایک مختصر سا قطعہ تاریخِ جلوس اپنے قدیمی شاگرد کی خدمت میں ارسال کیا۔ لیکن اس بار رامپور سے کوئی جواب نہ گیا۔ اور مرزا نے تعلقات کی تجدید نہ

ہوئی۔ اس کے دو سال بعد مولانا فضل حق نے جو ان دنوں رام پور میں مقیم تھے سلسلہ جُنبانی کی اور جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں، نواب صاحب فنِ شعر گوئی میں مرزا صاحب کے شاگرد ہوئے۔

نواب صاحب کے مرزا پر جو جلیل القدر احسانات ہیں، انہیں ہر شخص جسے مرزا کے حالات سے ذرا بھی دلچسپی ہے، جانتا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کو تمام عمر نواب فردوس مکاں سے زیادہ فیّاض محسن اور عالی حوصلہ مربّی میسّر نہیں آیا۔ انھوں نے غالب کی اُس زمانے میں دستگیری کی۔ جب اس کے خلاف بادشاہِ دہلی کی مدح گوئی اور اعانتِ باغیان کے شبہے ابھی باقی تھے اور جب اُس کی علانیہ طرفداری ایک والئ ریاست کے لیئے خلافِ مصلحت تھی۔ اخیر ۱۸۵۹ء میں جب مرزا سخت مایوسی کی حالت میں تھے۔ نواب صاحب انہیں لکھتے ہیں:-

"مشفقا! ہنگامِ ملاقات کے اکثر صاحبانِ ذیشان سے تذکار محامد وصفاتِ ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکارِ دولت مدار سے بیقین واثق ہے کہ مدارج شریف آپکے قدیم سے ہیں۔ پیشگاہ گورنمنٹ سے بھی اُسی مطابق ظہور میں آوے گا۔"

نواب صاحب کی مدد محض اخلاقی نہ تھی۔ عملی بھی تھی۔ اس زمانے میں مرزا کی پنشن بند تھی اور آمدنی کے تمام ذرائع سراسر مفقود تھے۔ لیکن نواب صاحب نے کئی مرتبہ دو دو ڈھائی ڈھائی سو روپے نقد ارسال کیئے۔ جب ان سے مرزا کی ضروریات پوری نہ ہوئیں اور انھوں نے مستقل تنخواہ کے لیئے لکھا تو نواب صاحب

نے فوراً ایک معقول رقم بطور ماہوار مشاہرہ کے مقرر کردی اس کے بعد بھی جب کبھی خاص ضرورت ہوتی تو مرزا بے تکلفی سے مانگ لیا کرتے تھے اور شاذونادر ہی ان فرمائشوں کی تعمیل میں کوتاہی ہوتی۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آداب نیاز بجا لاکر عرض کرتا ہوں کہ سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہوگیا۔ اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا، تم سے نہ کہوں، تو کس سے کہوں۔ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دوسو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیجد بجیئے گا تو جلا لیجیئے گا لیکن اس شرط سے کہ اس عطیہ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حدِ ادب"

نواب صاحب نے فوراً جواب لکھا:۔

"مشفقا! بپاس ارقام سامی کے، کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موالست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دوسو روپیہ کی سوائے مشاہرۂ معینہ معطوف رقیمتہ الوداد ہذا کے مرسل ہے اور چشمداشت آپکی لطف فرمائی سے یہ ہے کہ رسید ہنڈوی مذکور سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔"

نواب فردوس مکاں نے جس خسروانہ پیمانے پر غالب پروری کی اس کی تعریف نہ کرنا گناہ ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل ستائش امر یہ ہے۔ کہ اس فراوانئے عنایات کے باوجود انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی، جس سے شاعر کے عزِ نفس کو صدمہ پہونچے اور اُسے اپنی زبوں حالی کا احساس ہو۔ آج اقلیم شعر و سخن میں جو بلند مرتبہ غالب کا ہے یقیناً ناظم کا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ

بھولنا چاہیئے کہ دیسی ریاستوں میں رؤسا کے حاشیہ نشین آئین و روایات اور حفظ مراتب کی آڑ میں ایک ایسا نظام عمل قائم کر لیتے ہیں۔ جس کی پابندی خود دار ہستیوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ اور جس کے تحت رؤسا کی فیاضیوں سے وہی لوگ حصّہ وافر پاتے ہیں جو اہل کمال ہوں یا نہ لیکن "فن گداگری" میں دسترس رکھتے ہوں۔ آئین و اسلوب کی یہی الجھنیں تھیں جنہوں نے ۱۸۲۷ء میں مرزا غالب اور وزیر شاہ اودھ کی ملاقات نہ ہونے دی اور اس کے نصف صدی بعد حضور نظام سابق کو سر سید احمد خاںؒ کی ملاقات سے محروم رکھا۔ لیکن ہزار آفریں ہے نواب یوسف علیخاں کی عالی حوصلگی اور ادب نوازی پر کہ باوجودیکہ غالب ان کا تنخواہ دار ملازم تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اس سے برابری کا سلوک کیا اور اسے کسی ایسی بات پر مجبور نہ کیا جس سے اس کی غیرت اور خودداری مجروح ہو۔ مرزا جس بے تکلفی سے نواب صاحب کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا خط کے لفظ "تم" سے ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد جب مرزا، نواب کی بار بار کی دعوتوں کے بعد رامپور گئے ہیں۔ تو وہاں بھی انہیں نذر یا اس طرح کی دوسری اُلجھنوں سے پریشان نہیں کیا گیا۔ اور نواب صاحب ان سے بالکل دوستوں کی طرح ملے۔ مرزا اپنی تنخواہ کا ذکر کر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ نہ صورت ملاقات کی ہے لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی اور بس۔"

نواب صاحب مرزا سے جو دوستانہ برتاؤ کرتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے بھی ہو سکتا ہے جو نواب فردوس مکان نے مرزا کو تعین تنخواہ کے وقت لکھا۔

"سامی صحیفۂ تلطف آگیں مورخہ دسویں اس مہینہ جولائی سنہ حال کا بیچ عین انتظار کے غازہ آرائے چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہوا۔ اور راو پر مراتب مرقومہ کے مطلع کیا اور ان غزلوں کی اصلاح سے مخلص کو کمال مسرت ہوئی اور بہ نظر آپ کی زیر باری کے اس مہینہ جولائی سے سو روپیہ مہینہ مقرر کیا گیا اور دفتر میں نام آپ کا مندرج کیا گیا۔ ہر مہینے مقررہ تنخواہ پہنچے گی یقین ہے کہ آپ بھی بحصول کمال محبت میں فرمائیں۔"

نواب صاحب کی کرم فرمائی اور فیاضی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ایک لحاظ سے ماہوار تنخواہ حقِ شاگردی ادا کرنے کے لئے تھی۔ لیکن باوجودیکہ مرزا نے ضعفِ پیری کی بنا پر اصلاح اشعار سے معذرت چاہی اور بقول مولوی امتیاز علی عرشی اکتوبر ۱۸۶۳ء کے بعد انھوں نے بہت کم اشعار کو اصلاح دی، لیکن ان کا وظیفہ انہیں باقاعدہ ملتا رہا۔ مرزا خود ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ ان کو لکھ کر بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے' اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپکی سرکار سے ملتا ہے۔ عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیئے۔ تو میں

سک نمبر[1] سہی - ورنہ خیرات خوار سہی - اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہو تو جو آپ کی مرضی ہے - وہی میری قسمت ہے - برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی - اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے - آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیئے جاتے ہیں "

مرزا نے اپنے کئی خطوں میں نواب صاحب سے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے - اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نواب خلد آشیاں مرزا کو اپنا مخلص اور خیر خواہ دوست سمجھتے تھے - مکاتیب غالب کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ غدر کے آغاز میں مرزا اور نواب کے درمیان خفیہ خط و کتابت ہوئی تھی اور غالباً اس موقعہ پر مرزا نے انہیں دربار دہلی کے متعلق صحیح اور قابلِ اعتماد واقفیت بہم پہنچائی ہوگی۔ منشی امتیاز علی عرشی مکاتیب غالب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

" مرزا صاحب کے جدید رشتۂ اُستادی کے قیام پر چند ماہ گذرے تھے کہ غدر ۵۷ء کے آثار پیدا ہونے لگے - مرزا صاحب نے اپنے محسن شاگرد کی خدمت میں کچھ خطوط لکھے - جو ان کی حسب ہدایت چاک کر دیئے گئے - اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ان تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا اس لئے کہ جب آتشِ غدر بھڑک اٹھی اور نواب فردوس

---

[1] یعنی سک نمبر (sick number) مرزا کے خطوط میں انگریزی الفاظ کی تعداد خاصی ہے بعض تو فقط شوخی سے استعمال ہوئے ہیں - لیکن ظاہر ہے کہ مرزا کو اُردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے سے اس طرح گریز نہ تھا - جس طرح حالی کے بعض انشا پردازوں کو ہے -

مکاں کے لیئے ناگزیر ہوگیا کہ اپنا رویہ متعین کریں تو انھوں نے انتہائی ہوشمندارانہ طریق کار اختیار کیا.....

"یہ رویہ جسے مرزا صاحب نے "پیام خشک" سے تعبیر کیا ہے۔ اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک حالات کا صحیح علم اور ان کے پیدا ہونیکے واقعی اسباب قبل از وقت نہ معلوم ہوچکے ہوں"

جب نواب یوسف علی خاں مرزا کے شاگرد ہوئے۔ اس وقت تک انہیں شعر گوئی سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ مرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے ابھی تک ایک مصرعہ موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ناظم تخلّص بھی غالب کا تجویز کردہ تھا۔ نواب صاحب نے پہلی غزل میں یوسف تخلّص استعمال کیا تھا۔ لیکن مرزا نے انہیں لکھا "میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلّص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیماں - ان میں سے جو پسند آئے، رہنے دیجئیے" نواب صاحب کا ایک مختصر سا دیوان شائع ہوا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح کلیات ظفر میں ذوق کا کلام شامل ہے۔ دیوان ناظم میں بھی غالب کے نتائج فکر موجود ہیں۔ ان نظر کی ایک اشاعت میں لکھا تھا۔

"البتہ اگر نواب یوسف خاں ناظم کے دیوان سے وہ اشعار کسی صورت علیحدہ کیئے جاسکیں جو مرزا نے کہہ کر اپنے شاگرد کو ہبہ کر دیئے تھے تو ادب اُردو میں ایک بیش قدر اضافہ ممکن ہے"

ہم نے یہ روایت کئی لوگوں سے سنی ہے۔ کسی کے پاس کوئی قابلِ وقعت ثبوت نہیں لیکن غالب کے ایک خط سے جو مکاتیب غالب میں شائع ہوا ہے،

خیال ہوتا ہے کہ نواب صاحب کے اشعار کی اصلاح الفاظ کی تبدیلی اور معمولی حک و اضافہ تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اس سے کلامِ خویش کا حاصل کرنا مقصود ہوتا تھا۔ نواب صاحب کے ایک خط کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:۔

"حضور نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلامِ خویش مطلوب ہے۔ اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی اور ان اشعار میں کلامِ خویش نہ تھا؟"

ہم نے اس مسئلہ پر ایک مستقل مضمون (دیوانِ ناظم میں غالب کا حصّہ) لکھا ہے۔ اور آئندہ سطور میں بھی چند اشعار پیش کریں گے۔ جن میں غالب کا رنگ نمایاں ہے لیکن اگر نواب فردوس مکان کا اپنا مرتبہ بحیثیت ایک شاعر کے نہ بھی مانا جائے تب بھی ان کی ذات ستودہ صفات میں ایسی خوبیاں تھیں جو انہیں اپنے تمام ہمعصر والیان ریاست سے ممتاز کرتی ہیں۔ اور غالب کے قدر دان تو ہمیشہ ان کا نام ادب اور احترام سے لیں گے۔ ہمارے نزدیک ان کا اصل مرتبہ بطور ایک شریف النفس انسان اور عالی حوصلہ مربیِ شعر و فن کے ہے ان کی شاعری فقط شاعر پروری کا بہانہ تھی۔ مرزا انہیں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مخمس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی۔ یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کرنا ہے۔"

دیوانِ ناظم میں معمولی اشعار زیادہ ہیں، لیکن آخر اس کلام کو غالب نے اصلاح دی ہے اور بڑی محنت سے اصلاح دی ہوگی۔ بعض اشعار میں غالب کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ع اے گُل بہ تو خرسندم، تو بوئے کسے داری:

اس لیئے ہم چند ایسے منتخب اشعار جن میں غالب کا رنگ زیادہ نمایاں ہے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیئے پیش کرتے ہیں ؎

میں نے کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط
تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ — آوازۂ قبول دعائے سحر غلط
سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا — شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط
ہاں سینہ سے نمائشِ داغِ دروں دروغ — ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط
بوس و کنار کے لیئے یہ سب فریب ہیں — اظہارِ پاکبازئ و ذوقِ نظر غلط

چند اشعار میں غالب کی "شوخیٔ اندیشہ" صاف نمایاں ہے اور انہیں پڑھ کر دیوانِ غالب کے بعض اشعار یاد آتے ہیں ؎

رخصتِ عرضِ حال کیا مانگوں — کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ رخصت ہو

دیکھنا شوخی کہ میرا پوچھتے پھرتے ہیں گھر — سن لیا ہے یہ کہ اس کو کچھ نہیں گھر سے غرض

سچے ہیں اپنے وعدہ کے آتے وہ خواب میں — ناظمؔ مجھی کو نیند نہ آئی تمام رات

وہ گھر کو دیکھنے آتے ہیں ناظمؔ — نہ کیوں بیٹھا رہا میں گھر لٹا کر

واں قافلہ منزل پہ بھی پہنچا یہ ہم اب تک
کرتے ہیں بیاباں میں بہ آوازِ درا رقص

ایک شعر خاص غالب کے رنگ میں ہے ؎

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہو گا!

ایک پُر لطف شعر رشک کے مضمون میں ہے ؎

کس کس کا کروں رشک اس آہ کنز ہیں ہر ذرہ بینا مجھے دیدۂ بینا نظر آیا

بعض اور پاکیزہ اور پُر لطف اشعار ہیں ؎

شبستاں میں ہو باغوں میں کھیلو مجھ سے کیوں پوچھو کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیونکر گزرتے ہیں

جس کو منظور رہو عالم کا پریشاں رکھنا اس کو کیا کام پڑا ہے، کہ سنوارے گیسو

مرزا اور نواب یوسف علی خاں کے مخلصانہ تعلقات کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جائے تعجب نہیں۔ کہ جب نواب صاحب اخیر ۱۸۶۴ء میں بعارضۂ سرطان بیمار ہوئے تو مرزا کو بیحد فکر لاحق ہوا۔ وہ نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"جب سے حضرت کے ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے۔ عالم الغیب گواہ ہے۔ کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر پر روٹی نہیں پکی ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبر وحشت اثر غلط نکلی حواس ٹھکانے لگے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا۔ کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا۔ اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔"

مرزا کو نواب صاحب کے غسلِ صحت کی اتنی جلدی تھی۔ اور اس قدر اشتیاق تھا کہ ابھی اس کی تاریخ کے تعین کے متعلق انہیں کوئی پختہ اطلاع دربارِ رامپور سے ملی بھی نہیں کہ انھوں نے ایک سنی سنائی افواہ کی بنا پر قطعہ تاریخ غسلِ صحت

اور قصیدۂ تہنیت تاریخِ[1] غسلِ صحت سے پہلے رام پور بھیج دیئے۔ ان کے بعد انہوں نے ایک فارسی نثر بھی نواب کی خدمت میں بھیجی۔ جس میں ستاروں اور سیاروں کی روش بتا کر لکھا تھا۔ کہ میں نے علمِ نجوم کے حساب سے پتہ لگایا ہے کہ غسلِ صحت ایسی ساعتِ مبارک میں ہو رہا ہے کہ اس کے اثر سے آپ عرصۂ دراز تک بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن علمِ نجوم کی بے اعتباری یا اس فن سے مرزا کی ناواقفیت ملاحظہ ہو۔ کہ عرصۂ دراز تک بیماریوں سے محفوظ رہنا تو درکنار نواب صاحب جشنِ صحت کے چند ہی ہفتوں بعد اور مرزا کی نثر پہونچنے سے ایک مہینے کے اندر راہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔

غدر کے بعد دہلی کی حالت

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکۂ معظمہ کا اعلانِ معافی ہوا تھا۔ اور ہندوستان کی عنانِ حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا قصیدہ ؎

در روزگار ما ہمہ اندشمار یافت
خود روزگار آنچہ درین روزگار یافت

جس کی نسبت حالی کا خیال ہے کہ اعلانِ معافی کی تقریب پر لکھا گیا۔ اس سے پہلے کا ہے۔ اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اور یہ قصیدہ اس سے پہلے ستمبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کے ساتھ اس وقت چھپ چکا تھا۔ جب مرزا اس اعلان سے بے خبر تھے۔ اس قصیدے کے کئی اشعار پیچیدہ اور ذومعنی ہیں۔ لیکن غالباً یہ فتح دہلی کی مبارکباد

---

[1] مطلع ہے ؎ مرحبا سالِ فرخی آئین عیدِ شوال و ماہ فروردین

ہے نہ کہ اعلانِ معافی کا شکریہ۔

اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو یعنی فتح دہلی کے سال سوا سال بعد ہوا۔ لیکن اگرچہ اب سوائے ان لوگوں کے جن کے خلاف خاص ثبوت تھے۔ عوام کی جاں بخشی کا اعلان ہو گیا۔ دہلی کا شیرازہ جو بکھرا ہوا تھا۔ اسے بندھتے بہت دیر لگی ہندوؤں کی آبادی کا حکم جنوری ۱۸۵۸ء ہی میں ہو گیا تھا۔ بعد میں کچھ مسلمانوں کو شہر میں آنے جانے کے لیئے ٹکٹ ملنے شروع ہوئے۔ اور پھر بعض کو شہر میں چند شرطوں کے ماتحت رہنے کی اجازت ملی۔ تعزیری ٹیکس نومبر ۱۸۵۹ء میں عائد ہوا چنانچہ مرزا ۹ر نومبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ٹون ڈیوٹی (Town duty) کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ر نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنا مل، مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں ہے کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے خلق کا اژدحام ہے آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا ہم کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہ رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آ رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔"

جب اسی سال دسمبر میں گورنر جنرل نے میرٹھ میں دربار کیا تو "مسلمانوں کی املاک کی واگذاشت کا حکم عام ہو گیا۔ جن کو کرایہ پر ملی تھیں۔ ان کو کرایہ معاف ہو گیا۔" علاوہ ازیں مرزا ۱۳ر دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اتنا مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے
تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ
اس کا معاوضہ وہ ایک سرکار سے ہوگا۔"

دہلی کو حکام پنجاب نے فتح کیا تھا۔ اس لیئے اس کا نظم و نسق بھی اب انہی کے ہاتھ میں تھا اور نئے انتظامات کے تحت دہلی صوبۂ پنجاب کا حصّہ تھی۔ لیکن اہالیان دہلی اس انتظام سے خوش نہ تھے۔ اور حکومت پنجاب کے طور طریقوں سے سخت نالاں تھے۔ سر سیّد نے بڑے زور سے اس کے خلاف احتجاج کیا (حیات جاوید)
اور مرزا بھی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیئے گا کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد
شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین جس حاکم
کی جو رائے میں آئے وہ ویسا ہی کرے۔"

اس زمانے کی عدالتی کارروائی کے متعلق یوسف مرزا کو ایک لطیفہ لکھا ہے:۔

"سنو حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا
کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثبوت ہو چکا ہے صرف
حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا "حافظ
محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ "میں" پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون ہے" عرض کیا
کہ "میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممّو ممّو مشہور ہوں۔" فرمایا "یہ بھی کچھ بات نہیں۔
حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممّو بھی تم۔ سارا جہان بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی
تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟" مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے۔"

میر مہدی جو دہلی کے حالات بار بار پوچھتے تھے۔ انہیں غدر کے بعد دہلی کا جو نقشہ بدلا تھا۔ اس کی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کٹڑہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رامجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ و حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔

قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اور اب جو کوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ بندۂ خدا' اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔"

ایک اور خط میں لکھا ہے۔

"بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ

چاندنی چوک - ہر روز مجمع جامع مسجد کا - ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی - ہر سال میلہ پھول والوں کا - یہ پانچوں باتیں اب نہیں - پھر کہو دلی کہاں ؟

یہ خط اخیر ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا - جامع مسجد جسے گرا دینے کے مشورے[۱] دیئے جا رہے تھے - ابھی تک واگذاشت نہ ہوئی تھی - اور ابھی دو سال تک اور حکومت کے قبضے میں رہی - چنانچہ فتح دہلی کے کوئی پانچ سال بعد ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کو مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں :

"جویائے حال دہلی و الور سلام لو - مسجد جامع واگذاشت ہو گئی - چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنا لیں - انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا - دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الٰہی بخش - مولوی صدر الدین - تفضل حسین خاں - تین یہ ساتویں نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابو الظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے - اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون !"

عام مقبولیت

ہم نواب رامپور سے مرزا کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں لیکن اس وقت ان کے قدردان فقط رامپور ہیں نہ تھے بلکہ سارے ہندوستان میں موجود تھے - بنگال میں میسور کے شاہی خاندان کے رکن شاہزادہ بشیر الدین اور خان بہادر عبد الغفور نساخ - سورت میں نواب میر غلام بابا خاں ، نواب لوہارو کے صاحبزادے مرزا علاء الدین اور بھائی نواب ضیاء الدین غالب کے شاگرد تھے - بڑودہ کے رئیس نواب میر ابراہیم علی خاں غزلیں اصلاح کے لیئے بھیجتے تھے اور الور کے مہاراجہ غالب کے مداح تھے - الہ آباد میں اگرچہ خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر قاطع برہان کی بحث میں مرزا سے متفق نہ تھے لیکن ان کے کمال شاعری کے معترف تھے - اسی

---

۱ یہ بھی تجویز ہے کہ شاہجہانی مسجد جامع کو گرجا میں تبدیل کر دیا جائے " (خطبات گارسن دتاسی ص ۲۱۷)

طرح پنجاب میں ان کی دستنبو بہت مقبول ہوئی۔ اور وہاں ان کے اردو رقعات کی بہت مانگ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ حیدر آباد کے آسودہ دلوں نے ان کی کوئی قدر نہ کی۔ اور مرزا نے نواب مختار الملک کی تعریف میں جو تقبیں قصیدہ ۱۸۶۱ء میں لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کا انہیں کوئی صلہ نہ ملا۔[1] لیکن حیدر آباد کے علاوہ تمام ہندوستان میں ان کے قدردان اور مداح موجود تھے۔ اب ان کی شہرت اس قدر مستحکم ہو گئی تھی کہ اہل نظر ان کی زیارت کیلئے آتے اور اس بادشاہِ اقلیم سخن کو خراجِ عقیدات ادا کرتے۔

شاہ غوث علی قلندر اور مرزا

ہندوستانی صوفیہ کے اردو تذکروں میں شاید ہی کوئی کتاب تذکرۂ غوثیہ سے زیادہ دلچسپ ہو گی۔ جس میں اس زمانے کے ایک آزاد خیال بزرگ شاہ غوث علی قلندر کے ارشادات جمع ہیں۔ شاہ صاحب بھی مرزا سے ملنے گئے تھے اور چونکہ دونوں طبیعتیں ایک رنگ کی تھیں۔ اس لیے جلدی ان میں دوستی ہو گئی اور مرزا اور شاہ صاحب کی ملاقاتوں کا ذکر تذکرۂ غوثیہ میں محفوظ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے تھے

"ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسنِ اخلاق سے ملے۔ لبِ فرش تک آکر لے گئے۔ اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر ؎

---

[1] مرزا غالب ایک اردو خط میں لکھتے ہیں:" میں نے مختار الملک کو قصیدہ بھیجا۔ کچھ قدر دانی نہ فرمائی۔ رد فرقہ وہابیہ پر ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی وہ محی الدولہ کو بھیجی رسید بھی نہ آئی۔ اب سُنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوسِ انا ولا غیری بجا رہے ہیں۔ اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔"

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو   تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب! یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔ اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے۔ مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں، ہوں میخوار روسیاہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لیکر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے، کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف 'فسانہ عجائب' لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب! اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانہ عجائب کی کیسی ہے۔ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے اجی لاحول و لاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا، اور کہا کہ ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے، یہ قصہ سنایا۔ اور کہا کہ حضرت! یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہوگیا ہے۔ آیئے آج اس کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم انکے ہمراہ ہولیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب!

رات میں نے فسانۂ عجائب۔ کو بغور دیکھا تو اس کی خوبیٔ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی۔ اور کیوں نہ ہو اس کا مصنّف اپنا جواب نہیں رکھتا غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرورؔ کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بُلایا۔ اس وقت بھی میاں سرورؔ کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ اَلْمُؤْمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِہٖ وَ لِسَانِہٖ ؎

مباش در پے آزار ہر چہ خواہی کن :
کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالبؔ سے پوچھا۔ کہ تم کو کسی سے محبّت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰؓ سے، پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰؓ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبّت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے؟"

Stenographer

چراغِ سحری

حق آں گرمیٔ ہنگامہ کہ دارم بشناس

اے کہ در بزمِ تو مانم بہ چراغِ دمِ صبح — غالب

قاطع برہان

غدر کا ہنگامہ فرو ہوئے اب کئی سال ہو چکے تھے۔ مغلوں کی دہلی تو غدر کے بعد تباہ و برباد کر دی گئی۔ لیکن اب جان و مال کا خطرہ ختم ہو چکا تھا۔ برباد شہر کے رہنے والوں میں سے جو لوگ آزاد یا آغا یا حالی کی طرح نوجوان تھے اور ترکِ وطن کر سکتے تھے۔ وہ تو لاہور یا رام پور یا حیدر آباد جا پہنچے تھے لیکن بہرحال یہاں بھی ایک بستی آباد ہو رہی تھی۔ ذاتی طور پر غالب کو اس وقت مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ رام پور سے سو روپیہ ماہوار آتا تھا۔ پنشن جاری تھی۔ دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے۔ لیکن قاطع برہان کی اشاعت سے انھوں نے جو مخالفت عامہ مول لی۔ اس نے یہ زمانہ اُن کے لیئے بہت تلخ کر دیا۔ قاطع برہان اوائل ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی اور اکتوبر ۱۸۶۱ء کے بعد شائع ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو دستنبو کا ثمر ثانوی سمجھنا چاہیئے۔ دستنبو کی تحریر میں مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب انہیں الفاظ کے اصل معانی اور فنی پر

زیادہ غور کرنے کی ضرورت پڑی۔ جس کے لئے انھوں نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب وساتیر بھی تھی۔ اور چونکہ عربی الفاظ ترک کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے۔ انھوں نے دیکھا ہوگا کہ "برہان قاطع" میں جو معنی دیئے ہیں وہ وساتیر کی عبارت پر نہیں پھبتے۔ چنانچہ جب "دستنبو" ختم ہوگئی اور انھوں نے برہان کو شروع سے لے کر آخر تک بغور پڑھا، تو انہیں کئی بے قاعدگیاں نظر آئیں۔ انہیں اکٹھا کر کے انھوں نے دس جزو کا ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے شائع کیا۔ اور تین چار سال بعد تصحیح و اضافہ کے بعد دوسرا ایڈیشن درفش کاویانی کے نام سے شائع کرایا۔ قاطع برہان کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ مرزا کی آزاد قوت فیصلہ ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے کہ جس طرح مولینا اسمٰعیل شہیدؒ نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو ابھارا تھا۔ مرزا آرائے عامہ کے پابند نہ تھے اور ہر ایک مسئلہ پر آزادانہ تنقید جائز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ وہ درفش کاویانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"مرا نیز خردے درد انے دادہ اند۔ فراز آوردہ (یعنی نتائج) اندیشہ بیگانگاں را چوں بہ پذیرم و از نیروئے خرد خداداد کار چرا نگیرم"۔[1]

وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو بنظرِ تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولینا اسمٰعیل کی طرح

---

[1] "آخر یہ فن امورِ دینی میں سے تو نہیں ہے۔ کہ جو امام اعظم کے قول کو نہ مانے وہ مرتد ہے۔ قوتِ قیاس کا مادہ اوروں میں تھا۔ ہم کو مبداء فیاض سے یہ قوت عطا نہیں ہوئی ؟"
(شمس العلماء مولوی ضیاء الدین کے نام مرزا غالب کا خط)

اگلوں کے فیصلہ کے سامنے اندھا دھند سر نہ جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو۔ کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ سب حق ہے کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟"

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ نقطۂ نظر کہ جو اگلے کہتے تھے، سب درست ہے صحیح نہیں۔ اسی طرح کورانہ تقلید کو چھوڑ کر اندھا دھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلہ کا فیصلہ اُس کے اپنے حسن و قبح سے ہو سکتا ہے لیکن اس بارے میں بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فنِ لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اور ان کے لحاظ سے بُرہانِ قاطع پر نکتہ چینی کی ہے وہ بیشتر صحیح ہیں۔ مثلاً مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں مصدر کے معنی دیئے جائیں تو مشتق کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ درست ہے۔ اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنفِ بُرہان نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح شعراً نے الفاظ سے جو معانی استعارے کے طور پر کسی خاص نظم میں مراد لیئے تھے۔ انہیں بھی مصنف نے مستقل لغت کے طور پر درج کیا تھا۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں:۔

"افزودن شمارۂ لغات بہر صورت پیش نہاد ..... چنانکہ کمال اسمٰعیل را خلاق المعانی لقب است۔ اگر ایں بزرگوار اخلاق الالفاظ خوانند چہ عجب است"

ان اصولی اعتراضوں کے علاوہ مرزا کو بعض الفاظ کے معانی سے بھی اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف انہیں اکثر فرہنگ نویسوں سے تھا۔ وہ وجہ اس کی یہ دیتے تھے۔

"جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں مشہور و غیر مشہور۔ کچھ کم سو رسالے ہوں گے

ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہلِ زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذہ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے بمناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیئے۔ استنباط معنی کا مدار قیاس پر۔"

مرزا کہتے تھے۔ کہ ایسی فرہنگیں بے وقعت ہیں جو اہلِ زبان کہیں صحیح ہے حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں اور اگرچہ مرزا کی رائے بہت حد تک صحیح ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ آخر اساتذہ شعرا بھی تو بیشتر اہلِ زبان ہیں۔ اور اہلِ زبان اپنے الفاظ کے جو معنی بتائیں گے۔ انہیں اساتذہ کے کلام پر ٹھیک بٹھانا بھی ضروری ہوگا۔ اور اس طرح ان کے معانی اور فرہنگ نویسوں کے دیئے ہوئے معانی میں فرق نہ ہوگا۔

قاطع برہان کی مخالفت

قاطع برہان ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی اور جلد ہی اس کی مخالفت میں کتابیں شائع ہونی شروع ہوگئیں۔ سب سے پہلے جو کتاب شائع ہوئی۔ سید سعادت علی سابق میر منشی راجپوتانہ ریزیڈنسی کی محرق قاطع تھی۔ مرزا اس کی نسبت تیغ تیز میں لکھتے ہیں:۔

"ایک مرد بے مغز معوج الذہن، نہ فارسی دان، نہ عربی خواں، نے میری نگارش (قاطع برہان) کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی۔ اور محرق قاطع اس کا نام رکھا:۔

ایک اردو خط میں منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا ہے:۔

"اہا ہا محرق قاطع کا نسخہ تمہارے پاس پہنچا ع

کا ے کہ خواستم ز خدا شُد میسّرم

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصّہ آگیا۔
ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کیئے۔ دو طالب علموں نے
اُردو میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ
کر جانوگے۔ کہ مؤلف اس کا احمق ہے۔ اور جب وہ احمق دافع ہذیان
سوالات عبد الکریم اور لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا۔ اور محرق کو
ڈھونڈ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔"

محرق کی مخالفت اور قاطع برہان کی حمایت میں جن تین کتابوں کا ذکر مرزا نے مندرجہ بالا خط میں کیا ہے۔ ان میں سے دافع ہذیان فارسی میں ہے۔ یہ مولوی نجف علی کی تصنیف ہے۔ مولوی صاحب کی مرزا سے ملاقات نہ تھی۔ فقط اتفاق رائے کی وجہ سے انھوں نے مرزا کی حمایت کی۔ مرزا ایک خط میں مولوی نجف علی کی نسبت میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"واللہ اگر مولوی صاحب میرے گھر آئے ہوں۔ یا میں نے اون کو دیکھا ہے، چہ جائے اختلاط و ارتباط! صرف بہ رعایت جانب حق چند کلمات انھوں نے لکھے۔"

جب مرزا نے یہ خط لکھا اس وقت تک محرق کی تردید میں دافع ہذیان اور سوالات عبد الکریم لکھے جا چکے تھے۔ لیکن مرزا چاہتے تھے کہ اُردو میں کوئی رسالہ شائع ہو جائے جس میں محرق کی غلطیاں اور جامع محرق کی کوتاہیاں پورے طور پر ظاہر ہوں۔ چنانچہ انھوں نے میر غلام حسنین قدر بلگرامی پر ڈورے ڈالنے شروع کیئے۔ عام طور پر ان کے قدر کے نام رسمی ہوتے تھے۔ اور "بندہ پرور"۔ "سید صاحب"۔ "مشفق میرے"۔ اور

اس طرح کے دوسرے رسمی القاب سے شروع ہوتے تھے۔ اب انھوں نے میر صاحب کو ایک بڑا دوستانہ خط لکھا: اور اپنی ادبی جنگ میں مدد چاہی خط کا آغاز تھا "قرۃ العین میر غلام حسنین سلکم اللہ تعالیٰ" اس میں یہ لکھ کر کہ مولوی نجف علی نے بغیر کسی حق کے میری حمایت کی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"تم میرے یار ہو اور میری خدمت گزاری کے حقوق ہیں تم پر مجھ کو مدد دو اور اپنی قوتِ علمی صرف کرو۔ محرقِ قاطع برہان میرے پاس موجود ہے۔ مجھ سے منگاؤ۔ میں ہر موقع پر خطا اور زلتِ مؤلف کا اشارہ کر دوں گا ..... تمہارے پاس دو نسخے ایک دافع ہذیان ایک سوالات عبدالکریم مع استفتاؤ افتائے دستخطی علمائے دہلی موجود ہیں۔ اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشاراتِ سود مند پہنچیں گے۔ تم کو معاوضہ بہت آسان ہوگا ..... محرق اور صاحب محرق کا خاک اڑ جائے گا"[1]

لیکن مرزا کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور قدر نے محرق کا جواب لکھا چنانچہ مرزا نے دوسری سمت نظر دوڑائی۔ اور بالآخر لطائفِ غیبی میاں الداد خاں کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ ۲۸ صفحے کا رسالہ ہے۔ کتاب کے باہر میاں الداد خاں سیاح کا نام بطور مصنف کے لکھا ہوا ہے۔ لیکن فی الواقع یہ غالب کی تصنیف ہے۔ اور شروع سے ہی سب کو معلوم تھا کہ یہ کتاب مرزا نے خود لکھی ہے۔ مولینا حالی غالب کی اردو نثر کے متعلق لکھتے ہیں:-

---

[1] خطوطِ غالب ص ۱۹۶ - ۱۹۷

"مرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائف غیبی، تیغ تیز، اور نامۂ غالب"

مرزا کے خطوط سے خیال ہوتا ہے۔ کہ نہ صرف انھوں نے لطائف غیبی خود لکھ کر سیاح کے نام سے چھپوائی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ سیاح کے نام سے اعتراضات اخباروں میں چھپواتے تھے۔ اور سیاح کو اس کی اطلاع اعتراض چھپ جانے کے بعد ہوتی تھی! مرزا ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:-

"ایک نئی بات سنو محمد مرزا خاں میرے سگے بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ "اشرف الاخبار" اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لوگے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھپا یا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے"

محرق قاطع کے بعد کتاب قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی۔ مرزا رحیم بیگ کی ساطع برہان تھی۔ اس کے جواب میں مرزا نے ایک طویل اردو خط مصنف کے نام لکھا جو اس زمانے میں نامۂ غالب کے نام سے چھپا تھا۔ اور اب عود ہندی (مطبوعہ لاہور) میں شائع ہو گیا ہے۔ اس میں یہ دلائل و براہین مکتوب الیہ کے اعتراضوں کا جواب دیا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

تیسری کتاب میاں امین الدین مدرس پٹیالہ کی قاطع القاطع (۱۸۶۶ء) تھی۔ یہ کتاب اس طرح فحش و دشنام اور غلیظ کنایوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہ مرزا

نے اس کے مؤلف کے خلاف ہتک عزت کی بنا پر نالش کی۔ مقدمہ دسمبر ۱۸۶۷ء میں دہلی کے انگریز اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا۔ غالب کی طرف سے لالہ پیارے لال آشوب، حکیم لطیف حسین، مولوی نصیر الدین اور لالہ حکم چند بطور گواہ پیش ہوئے۔ اور فریق مخالف کی طرف سے (شمس العلماء) مولوی ضیاء الدین پروفیسر عربی دہلی کالج، مولوی سدید الدین اور بعض دوسرے علماء گواہ تھے۔ بحث ساری یہ تھی کہ میاں امین الدین نے مرزا کے متعلق جو فقرے اپنی کتاب میں لکھے ہیں اور جو اشارے کنائے استعمال کیے ہیں۔ ان سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ مولوی ضیاء الدین اور دوسرے گواہان صفائی نے ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ جب مرزا نے یہ دیکھا کہ ان ترجمانیوں کی بدولت مقدمے میں کامیابی مشکل ہے تو انھوں نے چند رؤسائے شہر کے ایماء پر ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی نامہ داخل کر کے مقدمہ واپس لے لیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مرزا کے لیے یہ تمام واقعہ سخت سوہان روح کا باعث ہوا ہوگا۔ کچھ میاں امین الدین کی فحش نگاری کی وجہ سے اور کچھ مولینا مولوی ضیاء الدین جیسے بزرگوں کے ارشادات کی وجہ سے جنہوں نے نہ صرف میاں امین الدین کے غلیظ کنایوں کی ترجمانی کرتے وقت سچائی اور انصاف کو بالکل بالائے طاق رکھا بلکہ کھلی عدالت میں مرزا کو "دائم الخمر" کہا۔ اور اس بنا پر ان کے لیے "کلاں اکبرآبادی" اور اس طرح کی قبیح ترکیبیں جائز قرار دیں (خدا کی شان ہے کہ اب انہی مولوی صاحب کے ورثاء بڑے فخر سے اپنے جدّ امجد کے نام غالب کے خط شائع کر رہے ہیں اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ان دونوں میں بڑی یگانگت تھی!)

انہی ایام میں غالب کے نام گمنام گالیوں سے بھرے ہوئے آنے شروع ہوئے۔ میاں امین الدین نے جس طرز کی کتاب لکھی تھی اس کے پیش نظر یہ خیال شاید غیر منصفانہ نہ ہو کہ غالباً ان تحریروں میں بھی ان کا اور ان کے چیلے چانٹوں کا ہاتھ تھا۔ غالب جیسے وضعدار انسان کے لیئے یہ زمانہ سخت ابتلا کا تھا۔ وہ ان دنوں غم و غصہ سے جس طرح آپے سے باہر ہو رہے تھے اس کا کچھ اندازہ اس بحث سے ہو گا جو ان دنوں حالی اور ان کے درمیان ایک معمولی مسئلے پر پیدا ہو گئی تھی۔ وہ عمر کے آخری ایک دو سال میں موت کی جس طرح آرزو کرتے تھے۔ اس کی اصل وجہ ان کی بیماری اور مالی مشکلات تھیں۔ لیکن میاں امین الدین اور مولوی ضیاالدین وغیرہ کی بے دردی و بے انصافی نے بھی ان کی عمر کے آخری سال بڑے تلخ کر دیئے۔

آغا احمد علی جہانگیر نگری قاطع برہان کے خلاف اور برہان کے حق میں سب سے ٹھوس اور مدلل کتاب (حجم قریباً پونے پانسو صفحے) ڈھاکہ کے مولوی آغا احمد علی احمد نے لکھی۔ جو ان دنوں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ملازم تھے۔ اور ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات مرتب کیا کرتے تھے۔ آغا احمد علی کو پینتیس سال سے زیادہ جینا نصیب نہیں ہوا۔ بنگالہ کی ادبی تاریخ میں ان کا ایک خاص مقام ہے ایک تو انھوں نے سید محمود آزاد جیسے شاگردوں کی تربیت کی۔ جو بنگالہ ہی نہیں برصغیر پاکستان و ہند کے فارسی شعرا کی صف اول میں بیٹھنے کے مستحق ہیں (ملاحظہ ہو ارمغان پاک میں آزاد کے کلام کا اقتباس) دوسرے انھوں نے خود قابل ذکر علمی کام کیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے لیئے انھوں نے منتخب التواریخ (بدایونی)

اقبال نامۂ جہانگیری۔ مآثر عالمگیری اور اکبر نامہ کے چند اجزاء تصحیح کے بعد اشاعت کے لیئے مرتب کیئے۔ فارسی مثنوی کی تاریخ پر ہفت آسمان فارسی زبان میں لکھی اور فارسی قواعد اور رباعی کے اوزان پر دو کارآمد رسالے اشتقاق اور ترانہ لکھے۔ وہ ۱۸۳۹ء میں بمقام ڈھاکہ پیدا ہوئے۔ جلد ہی علمی حلقوں میں نام پیدا کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں کلکتہ میں مدرسۂ احمدیہ قائم کیا۔ جس کے وہ آخر تک صدر مدرس رہے۔ ۱۸۶۲ء میں مدرسۂ عالیہ میں مدرس فارسی مقرر ہوئے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست میں نہ صرف فارسی شاعر سیّد محمود آزاد جہانگیر نگری اور ان کے بھائی اور مشہور اُردو مضمون نگار نواب سیّد محمد آزاد جہانگیر نگری۔ فدا سلہٹی۔ واصف۔ اشرف۔ عاصم کے نام آتے ہیں۔ بلکہ مشہور انگریز مستشرق بلاک مین بھی ان کا عقیدتمند شاگرد تھا۔ آغا احمد علی کا زمانہ بنگال میں فارسی کی نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ وہ نساخ اور عبیدی کے دوست اور ہمعصر تھے۔ اور اگر انہیں موت مہلت دیتی تو قرین قیاس ہے کہ وہ بنگال میں فارسی علم وادب کے مذاق و مطالعہ کو زیادہ پائیدار بنیادوں پر استوار کر جاتے لیکن افسوس کہ ۱۸۷۳ء میں بمقام ڈھاکہ ان کا انتقال ہو گیا۔

آغا احمد علی کی کتاب جس کا نام مؤید برہان ہے ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے جواب میں مرزا غالب نے ایک رسالہ تیغ تیز کے نام سے شائع کیا۔ جس میں قاطع برہان کے مخالفوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور مؤید برہان کے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔ اس میں وہ مرزا احمد علی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"عربیت میں ابن الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی

---

۱ ملاحظہ ہو ہفت آسمان کے شروع میں ملا بلاک مین کا سوانحی دیباچہ۔

میں کمترین جتنے الفاظ تذلیل کے ہیں وہ چن چن کر میرے واسطے استعمال کیئے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحب عزت و شان ہے۔ عالی خاندان ہے۔ امرائے ہند، رؤسائے ہند، مہاراجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ کا خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں خان صاحب بسیار مہربان دوستاں القاب ہے جس کو گورنمنٹ "خان صاحب" لکھتی ہے۔ اس کو سڑی اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں۔ فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے ضرب الغلام اہانت المولے گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا؟ مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا ہیں نے "معلم" امین بے دین کو شیطان کے حوالے کیا اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔

تیغ تیز کے علاوہ مرزا نے اکتیس شعر کا ایک فارسی قطعہ آغا احمد علی کے نام لکھ کر بھیجا جس میں ان کی کتاب پر بڑے پُر اثر طریقے میں نکتہ چینی کی ہے۔ آغا احمد علی کی پیدائش بنگال میں ہوئی تھی لیکن ایرانی النسل ہونے کے دعویدار تھے۔[1] مرزا اس

---

[1] یہ دعویٰ اس قدر بے بنیاد نہ تھا۔ آغا احمد علی کے بزرگ اصفہان کے رہنے والے تھے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور پھرتے پھراتے ڈھاکہ آ پہنچے۔ یہاں کئی ایرانی تھے وہ بھی یہیں بس گئے۔ ڈھاکہ کے چند ایرانی خاندان اب بھی گھر پر فارسی بولتے ہیں اور غالباً آغا احمد علی کی زبان بھی یہی تھی۔

متعلق لکھتے ہیں ؎

ہر کہ بینی بازبانِ مولدِ خود آشنا است ساز نطقِ موطنِ اجداد بے جاکردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است

آگے چل کر جو شوخ فقرے انھوں نے خود صاحب برہان کی نسبت لکھے تھے ان کی بڑے لطف سے توضیح کی ہے۔ اور مولوی صاحب کی بدکلامی کی شکایت کرتے ہیں ؎

صاحبِ علم و ادب آنکہ ز افراطِ غضب چوں سفیہاں دفترِ نفرین دم واکردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد ولے ننگ نا ارد علم زاں کارے کہ خواجہ کردہ است
انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع "سے کشد آنچہ ما کردیم باوے خواجہ باما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت وائے بروے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام شوخیٔ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است

اس قطعہ کا جواب آغا احمد علی کے شاگرد مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی کی طرف سے دیا گیا ؎

فرقِ حق و باطل اے صاحب نظر بشنو زمن گر ترا جویائے حق ایزد تعالیٰ کردہ است

آگے چل کر شاعر اپنی نسبت کہتا ہے ؎

من کیم؟ عبدالصمد، در شعر نامم من فدا شہر سلہٹ مولدم ایزد تعالیٰ کردہ است

اس قطعے کا جواب غالب کے شاگردوں نے دیا۔ تیغ تیز کا جواب آغا احمد علی نے شمشیر تیز میں دیا۔ جو قریباً سوا سو صفحے کا رسالہ ہے۔ اور ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔

قاطع برہان کی اشاعت پر جو تلخ بحث شروع ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ

مندرجہ بالا اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔ فی الحقیقت مبحث ہی ایسا تھا کہ اس میں اختلاف رائے کی گنجائش تھی۔ اور پھر مرزا کا اختلاف فقط صاحب برہانِ قاطع سے نہ تھا۔ وہ کسی بھی ہندوستانی فرہنگ نویس کے قائل نہ تھے اور جو لوگ ان فرہنگ نویسوں کو اپنا قبلہ اور امام بنائے ہوئے تھے۔ ان کی طرف سے مرزا کی مخالفت ایک امر لابد تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ایک علمی بحث اس قدر پست سطح پر جاری رکھی گئی اس کی وجہ ایک حد تک مرزا کا طرزِ تحریر تھا۔ ان کی کتاب قاطع برہان صاف اور مؤثر زبان میں لکھی گئی ہے۔ لیکن طرزِ تحریر ضرورت سے زیادہ شوخ ہے۔ اور صاحب برہان کا جا بجا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس سے برہانِ قاطع کے طرف دار ضرور آگ بگولہ ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر برہانِ قاطع میں غلطیاں تھیں تو قاطعِ برہان بھی غلطیوں سے پاک نہ تھی۔ اور مرزا کا یہ دعویٰ تو کسی طرح قابلِ قبول نہ تھا کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود آغا احمد علی کو اہلِ زبان نہ سمجھا جائے۔ لیکن مرزا باوجودیکہ نہ ان کے آبا ایران سے آئے نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے۔ اہلِ زبان گنے جائیں! وہ نامۂ غالب میں لکھتے ہیں:-

"اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالبؔ تیرا بھی مولد ہندوستان ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندی ہندی مولد و پارسی زبان ہے ؎

ہرچہ از دستگہِ پارس بہ یغما بُردند   تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اسے بھلا سوائے غالبؔ کے معتقدین کے کوئی کیسے مانتا اور واقعہ یہ ہے کہ مرزا نے ہندی نثراد فارسی نویسوں پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ اگر کوئی اہلِ زبان کرتا تو لوگ اتنے برافروختہ نہ ہوتے۔ لیکن چونکہ مرزا خود ہندی نثراد اور ترک النسل تھے

ان کا دعویٰ برتری کوئی نہیں مانتا تھا۔

آغا احمد علی کا ذکر کرتے ہوئے حالی کے قلم نے عجب ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لکھتے ہیں: "ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطن کلکتہ جنہوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب موید البرہان لکھی ہے۔ جس کے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لیئے چھان مارا۔۔۔" یوں تو آغا احمد علی جیسے ممتاز اور مستند عالم کے لیئے "ایک شخص" کی حقارت آمیز ترکیب کا استعمال ہی اس معنوی اور شخصی خلیج کو نمایاں کرتا ہے۔ جو بنگالہ اور شمالی ہندوستان کے اہل قلم میں تھی (اور جسے پاٹنا اب مشرقی اور مغربی پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کے لیئے شرطِ اولیں ہے) نام بھی غلط لکھا ہے۔ وطن بھی غلط دیا ہے۔ ایرانی النسل کو مغل بنا دیا۔ کتاب کا نام بھی غلط ہے (صحیح نام موید برہان تھا) یقیناً کتاب حالی کی نظر سے نہیں گزری۔ لیکن ان سطور کا شاید زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے۔ کہ ان میں صحیح علمی اور تحقیقی طریقِ کار سے بھی بے اعتنائی برتی ہے۔

اگر آغا احمد علی نے قاطع برہان کے اٹھائے ہوئے سوالات کی تحقیق کیلیئے ایشیاٹک سوسائٹی کا تمام کتب خانہ چھان مارا۔ تو یہ کوئی قابلِ معذرت یا انوکھا فعل نہ تھا۔ بلکہ صحیح علمی طریقِ کار یہی تھا۔ اب جو مسائل سامنے تھے۔ وہ ادبی یا تخلیقی نہ تھے۔ کہ ذہانت اور ذکاوت کے سہارے یا علم لدنی کی مدد سے حل ہو جائیں وہ علمی اور تحقیقی تھے (جن میں صحیح راستہ ڈھونڈھنے کے لیئے ماخذ اور حوالے کی ضرورت تھی۔ اور ایک کتب خانہ کی اعانت درکار تھی۔ غالب کو شاید اب اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ موید برہان اور آغا احمد علی کے متعلق انھوں نے جو کچھ فارسی قطعہ یا نثر

میں لکھا۔ ان سے وہ "جلال" غائب ہے۔ جو برہان قاطع اور اس کے دوسرے حمایتیوں کے متعلق اظہار خیال میں تھا۔ مرزا غالب کو اب شاید اس امر کا احساس ہو گیا تھا۔ کہ جس بھنور میں انہوں نے چھلانگ لگائی تھی۔ اس میں تیراکی کے لئے زیادہ مشق اور مزاولت کی ضرورت تھی۔ ان کی ذہانت' سلامت روی۔ باریک بینی۔ فارسی زبان سے لگاؤ مسلّم۔ ہرمزد۔ مولوی فضل حق۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت سے بھی انہیں بڑا فائدہ پہنچا ہوگا۔ فن شاعری اور تخلیقی ادب میں وہ امام لیکن علم لغت (Lexicography) میں سربلندی حاصل کرنے کے لئے برسوں کی جس تعلیم و تدریس اور تربیت کی ضرورت تھی۔ اس کا وہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے۔ عربی کے وہ عالم نہ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ادیب نے ایک کتب خانہ کبھی جمع نہ کیا ہو۔ اور فقط حافظہ پر بھروسہ کرتا ہو۔ وہ اس معاملے میں ایک ایسے پیشہ ور مدرس اور فاضل سے کسی طرح بازی لے جائے۔ جسے ملک کا (اس زمانے کا) سب سے بڑا کتب خانہ میسر ہو۔ اور وہ اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

آغا احمد علی نے کتاب بڑی محنت سے لکھی۔ اور برہان کے مؤلف کی تائید میں لغت کی متعدد قدیم کتابوں سے حوالے دیئے۔ لیکن ان سے مرزا کے اس بنیادی اعتراض کا جواب نہیں ملتا۔ کہ چونکہ لغت کی یہ کتابیں بیشتر ہندوستان میں لکھی گئیں (مقامی ضروریات کے مطابق اسلامی ہندوستان میں فارسی لغت نویسی اور قواعد نگاری کو جو فروغ ہوا۔ وہ ایران میں اٹھارھویں صدی تک ہرگز نہ تھا) اہل زبان نے انہیں نہیں لکھا۔ بلکہ ایک مؤلف دوسرے سے نقل کرتا آیا ہے۔ اس لئے برہان عجم کی طرح یہ بھی قابل اعتماد نہیں۔

غالب کی قاطع برہان یا اس کی اصلاح یافتہ صورت درفش کاویانی پر تبصرہ کرنا ایک ماہر فن کا کام ہے۔ بادی النظر میں اس کے مطالعہ سے مرزا کی قوتِ تحریر غائر نگہی، جرأت علمی اور آزاد خیالی واضح ہوتی ہے۔ ان کے طرف داروں میں ان کے دوستوں اور مقامی علماء کے علاوہ آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی جیسے اہل زبان تھے۔ جو اعتراض انھوں نے برہان قاطع پر کیئے۔ اس قسم کے اعتراضات مشہور ایرانی اہلِ قلم رضا قلی خاں ہدایت نے بھی کیئے۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں سفرِ ایران کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ اب بھی برہان قاطع کی وہاں بڑی قدر ہے۔ اس کے نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ اور غالب کی قاطع برہان سے ایران میں کوئی واقف نہیں:

طویل علالت

غدر کے بعد ایک عرصے تک تو غالب کی پنشن خلعت اور دربار کے غم نے پریشان رکھا۔ اور جب ان الجھنوں سے نجات ملی۔ تو قاطع برہان کی اشاعت سے جو ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ اس کی تلخی اور اذیت برسوں تک سوہانِ روح بنی رہی۔ لیکن غالب کی اس زمانے کی پریشانیاں انہی قضیوں تک محدود نہ تھیں۔ وہ اس زمانے میں فسادِ خون کے مرض میں مبتلا تھے۔ جس نے ان کی حالت اور بھی قابلِ رحم بنا دی تھی۔

فسادِ خون اور جلد کی بیماریاں، جب ایک دفعہ جڑ پکڑ لیں تو وہ مہینوں نہیں، برسوں تک رو بہ اصلاح نہیں ہوتیں۔ مرزا بھی دو تین سال تک ان میں گرفتار رہے۔ وہ تین مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"چھٹا مہینہ ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت

پیدا کی۔ پھوڑا ایک کر پھوٹا اور پھوٹ کر ایک زخم، زخم کا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ اُسترہ سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے افاقہ کی صورت نظر آتی ہے۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ افاقہ عارضی تھا۔ اور جب ایک پھوڑا درست ہوتا تو دوسرا نمودار ہو جاتا۔ ۱۶ راگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں تفتہ کو لکھا ہے:۔

"ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سروِ چراغاں ہو گیا۔ طاقت نے جواب دے دیا۔ دن رات لیٹے رہتا ہوں۔"

ان پھوڑوں نے جو تکلیف دہ حالت پیدا کر دی تھی۔ اس کا ذکر کئی خطوں میں ہے۔ ایک خط میں نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:۔

"نہ تپ نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑے پہ ایک زخم، ہر زخم پر ایک غار ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خور و خواب رہا، اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی۔ دو گھڑی غافل رہا ہوں گا۔ کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اُٹھی۔ جاگ اُٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا۔"

مرزا کی یہ حالت تھی۔ تو جائے تعجب نہیں کہ وہ زندگی سے بیزار اور موت کے آرزو مند تھے۔ وہ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا ہوں ..... روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں، کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع، پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیانِ واقع ہے ع

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردم :

مرزا کی اس بیماری نے اس قدر طول پکڑا۔ کہ بعض حلقوں میں تو ان کی وفات کی خبر مشہور ہو گئی۔ وہ فروری ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں نواب انور الدولہ کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کی پرسش کے قربان جاؤں۔ کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثل میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھا جھوٹ! درصورتِ مرگ نیم مردہ و در حالتِ حیات نیم زندہ ؎

درکشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن   ایں کہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست"

دو سال مصیبتیں جھیلنے کے بعد مرزا ان بیماریوں پر غالب تو آ گئے لیکن ان سے کمزوری بہت بڑھ گئی۔ وہ نومبر ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں قاضی عبد الجمیل کو لکھتے ہیں:۔

"اب میں تندرست ہوں، پھوڑا پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے۔ کہ خدا کی پناہ! اور ضعف کیونکر نہ ہو۔ برس دن سے صاحب فراش ہوں۔ ستر برس کی عمر ہے۔ جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ بن کر نکل گیا۔ سن کہاں جواب پھر تولید دم صالح ہو، بہرحال زندہ ہوں اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنونِ احسان۔"

نواب کلب علیخاں اور غالب

ہم فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں سے مرزا کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کی وفات اپریل ۱۸۶۵ء میں ہوئی۔ اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ مرزا کے تعلقات نواب یوسف علی خاں سے بالکل ذاتی تھے۔ اور جو تھوڑی بہت خدمت وہ والئ ریاست کی کرتے تھے۔ اسکے مقابلے میں ان کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا تھا۔ اس لئے ممکن تھا۔ کہ نئے دور میں یہ تعلقات ختم ہو جاتے۔ مرزا کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے نئے رئیس کی تخت نشینی پر تہنیت نامہ لکھا۔ اور اس کے ساتھ اپنے وظیفے کے متعلق بھی درخواست کی۔ نواب خلد آشیاں نے فوراً جواب دیا۔

"مشفقا آنچہ مشاہرہ آں کرمفرما از عہد نواب صاحب وقبلہ فردوس مکاں مقرر است انشاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری ماندہ حسب ضابطہ بسامی خدمت رسیدہ خواہد بود۔"

تہنیت نامہ کے ساتھ مرزا نے جو قصیدہ لکھا تھا اس میں انھوں نے اپنے بڑھاپے اور کمزوری کا ذکر کر کے حاضر نہ ہونے کی معذرت کی تھی ۔

بر انجمن نرسیدم ز ناتوانائی | ولے بعرضِ ثنا و دعا نیم معذور
بخاک پائے تو گرد ستگاہ داشتمے | نبودے بخیم دوری در تو صبور
من آں کسم کہ ز افراطِ ورزشِ اخلاص | بغیبت است مراد عائے ہم دوام حضور
تو ئی رحیم دلا دمن سقیمے دوری بہ | مباد رنجہ شوی از نظارۂ رنجور
نظر بخستگی و پیری و تہی دستی | قبول کردن تسلیم من خوش است از دور

نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے وقت تو مرزا نے قصیدہ بذریعہ ڈاک بھیج دیا۔ لیکن جب انھوں نے چند ماہ بعد مسند نشینی کا باقاعدہ جشن کیا۔ تو مرزا کو رامپور جانا پڑا۔ وہ کہتے ہیں:۔

"رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا"

چنانچہ وہ غازی آباد۔ ہاپوڑ۔ مراد آباد ہوتے ہوئے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رامپور پہنچے اور جشن میں شریک ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے جشن بہت شاندار تھا۔ مرزا ۱۶ دسمبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکارِ رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پُر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے

وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہو گا۔ آج صاحبان عالیشان کی دعوت ہے۔ ٹپن[1] اور شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس محلس کو "طوائف الملوک" کہنا چاہیے۔"

مالی نقطۂ نظر سے مرزا کا دوسرا سفرِ رامپور بالکل ناکام نہ تھا۔ مولوی امتیاز علی عرشی مرزا کی آرزوؤں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

"نواب خلد آشیاں ... ۷ نومبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپیہ عطا فرما چکے تھے۔ تاہم ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو ۲۰۰ روپیہ بوجہ زادِ راہ مرحمت فرما کر مرزا صاحب کی اس آرزو کی بھی تکمیل کر دی گئی۔"

اس کے علاوہ رامپور کے سفر سے پہلے مرزا نے اپنے تعلقاتِ ریاست کے متعلق جو تشویشناک خبر سنی تھی، اُسے بھی نواب صاحب کے کرم و التفات نے غلط ثابت کر دیا۔ لیکن رامپور سے واپسی کے وقت ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے مرزا کی صحت پر برُا اثر ڈالا۔ اور انہیں بالکل نیم جاں کر دیا۔

مرزا ۲۸ دسمبر کو رامپور سے روانہ ہوئے۔ راستے میں دریائے گنگا کو پار کرنا تھا۔ جو ان دنوں سرمائی بارش کی وجہ سے طوفانی تھا۔ مرزا کی پالکی کشتیوں کے عارضی پُل کو پار کر چکی تو یہ پُل ٹوٹ گیا۔ اور ان کے اسباب کی گاڑیاں اور نوکر چاکر سب پیچھے رہ گئے۔ ناچار مرزا کو یکہ و تنہا بغیر پورے بستر کے، اور بغیر کسی کھانے

---

[1] یعنی ٹفن (Tiffen) دوپہر کا کھانا۔

کے مراد آباد کی سرائے میں رات گذارنی پڑی۔ اُن کی عمر اس وقت ستر سال کی تھی۔ وہ اس سردی کی تاب نہ لا سکے اور بیمار ہو گئے۔ مولوی محمد حسن اس زمانے میں مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ انہیں خبر ملی۔ تو وہ مرزا کو گھر لے گئے۔ اور پوری طرح تیمارداری اور غمخواری کی۔ پانچ سات دن کے بعد صحت ہوئی تو مرزا دہلی پہنچے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انہیں عارضی طور پر افاقہ ہو گیا۔ طبیعت اس کے بعد خراب رہی۔ وہ اس واقعہ کے قریباً چھ ماہ بعد ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"آگے ناتواں تھا۔ اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرا تھا۔ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ اور ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں۔ انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حرف سوجھنے سے رہ گیا۔"

ایک اور خط میں لکھا ہے :۔

"رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت یہ سب اسباب لُٹ گیا۔"

جب مرزا رام پور سے لوٹے۔ تو نواب کلب علی خاں کے تعلقات ان سے خوشگوار تھے۔ لیکن اس سے قریباً ایک سال بعد بدقسمتی سے ایک ایسی علمی بحث پیدا ہو گئی۔ جس نے ان تعلقات کو ضعف پہونچایا۔ اس بحث کی تہ میں بھی مرزا کا عام ہندوستانی لُغت نویسوں سے وہ اختلاف تھا۔ جس سے متاثر ہو کر انھوں نے قاطع برہان لکھی تھی۔ اور ایک با اثر علمی حلقے کی مخالفت گوارا کی تھی۔ آغاز اس کا اس طرح ہوا۔ کہ مولوی محمد عثمان خاں مدار المہام ریاست رامپور نے قصائد بدر چاچ

کی ایک شرح مرتب کی جس کے شروع میں نواب صاحب نے دیباچہ لکھا۔ اور دیباچہ بغرضِ اصلاح مرزا کے پاس بھیجا۔ اس دیباچہ میں نواب صاحب نے "ارتنگ" کو "ارژنگ" اور "آشیاں چیدن" کو "آشیاں بستن" کے معنوں میں استعمال کیا تھا معلوم ہوتا ہے مرزا نے ان جملوں میں ترمیم کردی۔ لیکن نواب صاحب اس ترمیم سے متفق نہ ہوئے۔ انھوں نے فرہنگ رشیدی اور فرہنگِ جہانگیری اور لغت کی دوسری کتابوں سے اپنی عبارت کے جواز میں نظیریں دیں۔ اور مرزا کو لکھا:۔

"اکثر مالک رقابان علم لغت ارتنگ و ارژنگ را بمعنے واحد پنداشتہ اند وعامۂ مفسرانِ کلامِ شیرازی متاخر البتہ "آشیاں چیدن" را مرادف "آشیاں بستن" نگاشتہ۔ چنانچہ نظیر ہر یکے ملفوف عنبریں نامۂ ہذا است۔ بمطالعہ خواہد رسید معہذا اگر طبع آں اوستادِ زماں بہ ترقیم الفاظ فی الجملہ نفورے داشتہ باشد۔ ہمچناں حوالۂ قلم نمایند کہ مبعوث عنہ را از تقریظ اصلاح شدہ چوں نفسانیت خود محو سازم۔ زیرا کہ مرا ازاں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است نہ از عرفی و دیگراں"

نواب صاحب نے خط بڑی متانت اور خوش اخلاقی سے لکھا لیکن مرزا کو ہندوستانی لغت نویسوں کے نام سے چڑ تھی۔ ان کے جواب میں قاطع برہان کی تھوڑی بہت تلخی آگئی:۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔

بعد تسلیم معروض ہے۔ اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا۔ "مرا ازاں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است" یہ ذلیل

کو عزت دینی اور دو دکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے، میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا، چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا۔ اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے، مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریق یاد نہیں۔

میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی، فصحائے عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد۔ ماخذ ان کا اشعارِ قدما۔ ہادی ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!!

فقیر اشعار قدما کا معتقد۔ ان لوگوں کے کلام کا عاشق، مگر جو لغات اُن کے کلام میں ہیں، اس کے معنے تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں، میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں۔ اب پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارژنگ وار ژنگ متحد المعنی اور آشیاں ساختن و بستن و چیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے" تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ لیکن نہ ان صاحبوں کے قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوندِ نعمت کے حکم کے مطابق ؎

تم سلامت رہو قیامت تک	دولت و عز و جاہ روز افزوں

انصاف کا طالب غالبؔ"

نواب صاحب کو یہ خط ناگوار گزرا۔ ایک تو اس میں مرزا نے ان لغت نویسوں کی ہنسی اڑائی تھی جن کی نواب صاحب کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی دوسرے نواب صاحب (یا ان کے مصاحبوں نے) نے چند ایک جملوں کے ایسے معنے مراد لیئے جو مرزا کے خیال میں نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے مرزا کو ایک طویل اور درشت خط فارسی میں لکھا۔ جس کا ماحصل یہ ہے :-

"آپ کا عجیب و غریب خط، جس میں قدیم ہندی نژادوں کی نسبت غلط معنی بتانے کا الزام اور دوسرے اعتراض اور یہ اظہار تھا کہ راقم کو بحث کا طریقہ نہیں آتا۔ موصول ہوا اور بڑی حیرانی کا باعث ہوا اس لیئے کہ ابھی تک سوائے علمی اُمور کی تحقیق و تفتیش کے کوئی بات ظہور پذیر نہ ہوئی تھی لیکن میں اس یگانۂ روزگار کی موشگافیوں پر حیران ہوں کہ میری تحریر کو بحث و اجتہاد پر محمول کیا گیا۔ اور اس طرح کے کنائے، مثلاً راقم کو استاد کہنا، یا لفظ بحث، جو دونوں خلاف واقع اور شکر رنجی کا باعث ہیں، لکھے گئے۔ پس اگر آپ کو یہی منظور رہے تو اس امر کا اشارہ کر دیں کہ فریقین کے درمیان "ترسیل رسائل" بند ہو جائے۔ ورنہ قلم کو غیر ضروری خارج البحث باتوں کی تفصیل سے باز رکھیں۔ جس کا نتیجہ دردِ سر کے سوائے کچھ نہیں ہو سکتا۔ راقم نے ان محققین کا پایہ جن کی تصنیفات مقبول عام ہیں، اپنے سے زیادہ سمجھ کر ان کے کلام کے حوالے دیئے تھے۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک، وہ قابلِ قبول نہ تھے تو چاہیئے تھا کہ آپ مہربانی سے ایسا لکھ بھیجتے، میری سمجھ سے باہر ہے۔ کہ بات کو اس قدر طول کیوں دیا

پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے "آپ کی غایت اس تکلیف سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سُنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے" اتنے ہی کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدارِ خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں"

مرزا ان دنوں ایک تو ضعف و ناتوانی سے نیم جان ہو رہے تھے۔ دوسرے مالی مشکلات بھی کچھ کم نہ تھیں۔ سب جانتے تھے۔ کہ اب مرزا چراغِ لب بام ہیں اور یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ ان کی وفات کے بعد آمدنی کے سب ذریعے مسدود ہو جائینگے چنانچہ کوشش شروع ہوئی کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے منہ بولے بیٹوں، مرزا باقر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں کا رام پور سے وظیفہ مقرر ہو جائے۔ تاکہ ان کی وفات کے بعد اس خاندان کو کچھ تو سہارا ہو۔ اس کے علاوہ مرزا حسین علی خاں کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی لیکن منگنی ہو چکی تھی۔ اس کے سسرال والوں نے تقاضا شروع کیا کہ اس فریضہ کو جلد سرانجام دو۔ مرزا کے پاس اخراجاتِ شادی کے لیئے کچھ نہ تھا۔ اور اب قرض بھی کہیں سے نہ ملتا تھا۔ لے دے کہ ان کے پاس دربار رام پور کا سہارا تھا۔ انھوں نے

نواب صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کچھ رقم عنایت فرمائیں تاکہ یہ کام انجام پائے اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔ رام پور سے اس کا حوصلہ افزا جواب گیا اور مرزا سے پوچھا گیا کہ آپ کو کتنا روپیہ مطلوب ہے۔ مرزا نے لکھا کہ باقر علی خاں کی شادی پر ڈھائی ہزار روپے خرچ آئے تھے" دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں جو کچھ دو گے۔ اوس میں شادی کروں گا" مرزا کو امید تھی کہ یہاں سے کچھ مل جائے گا۔ نواب مرزا خاں داغ اور جناب مظفر حسین خاں بہادر کی تحریروں سے اور بھی دل بڑھایا۔ چنانچہ رام پور کے عطیہ کے انتظار میں شادی بھی ملتوی ہوئی۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ مرزا ابھی اس امید میں تھے اور طریقے طریقے سے نواب صاحب کو یاددہانی کرا رہے تھے۔ کہ انہیں قرضخواہوں نے دق کرنا شروع کیا، اور شاید نالش کی بھی دھمکی دی۔ چنانچہ مرزا نے حسین علی خاں کے لیے جو کچھ مانگا تھا۔ اس سے قطع نظر کی۔ اور نواب سے درخواست کی۔ کہ قرضخواہوں سے گلو خلاصی کرانے میں مدد دیں وہ ۱۶؍ نومبر ۱۸۶۹ء کے ایک خط میں نواب صاحب کو لکھتے ہیں:-

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی۔ کہ اب کی تنخواہ سے ۵۴ روپے بچے ۶۳ روپیہ کا چھٹا ماہوار کا سو سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اوس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال۔ کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپے مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے"

اس عرضداشت کے جواب میں نواب مرزا خاں داغ نے مرزا کو لکھا۔ کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے۔ اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔" چنانچہ مرزا نے دوبارہ قرض کی مقدار لکھ کر بھیجی۔ اور نواب صاحب کو بھی یاد دہی کرائی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی میں کوئی حکم صادر نہ ہوا۔ اور مرزا کی یہ خواہش بھی تشنۂ تکمیل رہی۔

وفات اخیر عمر میں مالی الجھنوں اور ضعفِ قویٰ نے مرزا کو اس طرح پریشان کر رکھا تھا۔ تو جائے حیرت نہیں۔ کہ وہ موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے اور ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے لیکن ان کی طبعی زندہ دلی اور ظرافت ابھی برقرار تھی۔ اور موت کے متعلق بھی انھوں نے بڑی شوخ بیانیاں کی ہیں۔

۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنی تاریخ وفات کہی تھی "غالب مرد" اس سے پہلے بہت سی تاریخیں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ مرزا کے ایک عزیز شاگرد سے اس تاریخ کا ذکر آیا۔ تو انھوں نے کہا "انشاء اللہ یہ تاریخ بھی غلط ثابت ہوگی۔" اس پر مرزا کہنے لگے :۔ "دیکھو صاحب! تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو اگر یہ تاریخ غلط ثابت ہوئی۔ تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

ایک دفعہ دہلی میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے اپنے خط میں اس کا ذکر کیا تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔ "بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی۔ تو تُف بریں وبا۔"

اسی موضوع پر ایک دوسرے رنگ کا ان کا ایک شوخ شعر ہے۔ جس میں

شاید نواب صاحب رام پور کے موعودہ عطیہ کی طرف اشارہ ہے ؎

دو روز دیر کن اے مرگ خالصاً للّٰہ مگر بمن رسد آن وایہ کہ در راہ است

شعر و سخن سے مرزا کی دلچسپی اخیر عمر تک باقی تھی۔ اور خطوط لکھنے یا لکھوانے کا سلسلہ تو موت سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ مرنے سے چند روز پیشتر بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔ کئی کئی گھنٹوں کے بعد چند منٹ ہوش میں آتے اور پھر بیہوش ہو جاتے۔ جس روز انتقال ہوا۔ اس سے ایک روز پہلے حالی عیادت کو گئے۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ لیکن مرزا کے طبعی سکون، بلکہ شوخ طبعی میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ نواب علاء الدین نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ انہیں جواب دیا۔ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" اور ایک فارسی شعر لکھوایا جس کا حالی کو فقط ایک مصرع یاد رہا ع

نکر د ہجر مدارا بمن سر تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا کی وفات پندرہ فروری ۱۸۶۹ء کو تہتر برس چار مہینے کی عمر میں ہوئی ان کی تدفین کے وقت شیعہ سُنّی فرقوں میں اسی طرح کی ایک ہلکی سی عقیدتمندانہ کش مکش پیدا ہو گئی جو کبیر کی وفات پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہوئی تھی۔" سیّد صفدر سلطان نبیرۂ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو۔ کہ ہم اپنے طریقے کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر

نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہلِ سنّت کے موافق ادا کیے گئے۔

اب خاندان لوہارو کو اس قمار باز کی قدر و قیمت معلوم ہو چکی تھی۔ جس کی نسبت انھوں نے ۱۸۴۷ء میں اخباروں میں اشتہار دیا تھا۔ کہ اس سے ہمارا فقط دور کا اور وہ بھی سببی تعلق ہے۔ مرزا غالبؔ کی نعش کے وارث نواب ضیاء الدین تھے اور نہ صرف انھوں نے ان کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کیا۔ بلکہ اس نعش عزیز کو بڑے فخر کے ساتھ خاندانِ لوہارو کے قبرستان میں، اپنے عمِ محترم کی قبر کے پاس جگہ دی۔

جب مرزا کی وفات ہوئی شاہ غوث علی قلندر صاحب زندہ تھے کسی نے آکر خبر سُنائی۔ شاہ صاحب نے بڑا افسوس کیا۔ کئی حسرت بھرے شعر پڑھے اور مرزا کی نسبت کہا۔

"نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے ؎

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابی و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قطعہ

بروزِ حشر الٰہی چو نامہ عملم   کنند باز کہ آں روز باز خواہِ من است
بجز مقابلہ آں را ز سرنوشتِ ازل   اگر زیادہ و کم باشد آں گناہِ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

بیگم مرزا غالب کی وفات

غالب کی وفات سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ بلا مبالغہ اردو نظم و نثر کا آفتاب غروب ہو گیا۔ لیکن ان کی وفات سے جو صدمہ ان کے متوسلین بالخصوص ان کی باہمت بیوہ کو، جس کا ان کی شہرت اور ناموری میں کوئی حصہ نہیں، لیکن جو ان کی تمام مصیبتوں، بیماریوں اور تکلیفوں میں برابر کی شریک تھی، اس کا جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا تصور اور بھی جگر گداز ہے۔

مرزا غالب نے اپنی وفات کے وقت اپنے ورثار کے لیئے کوئی ترکہ نہ چھوڑا تھا۔ بلکہ مرتے وقت وہ آٹھ سو کے قرضدار تھے۔ اس کے علاوہ ان کی وفات پر آمدنی کے تمام ذریعے مسدود ہو گئے۔ مرزا کا بسر اوقات رامپور کے ماہوار مشاہرے اور سرکاری پنشن پر تھا اور یہ دونوں سلسلے ان کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ کی جو حالت ہوئی۔ اس کا تھوڑا بہت اندازہ اس عرضداشت سے ہو سکتا ہے جو بیگم صاحبہ نے اگست ۱۸۶۹ء میں نواب کلب علی خاں کی خدمت میں ارسال کی :-

"جناب عالی! جس روز سے مرزا اسد اللہ خاں نے وفات پائی ہے تو یہ عاجز بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے۔ کہ تحریر سے باہر ہے۔ اول تو یہ مصیبت ہے کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپیہ کے قرضدار مرے دوسری مصیبت یہ کہ پنشن انگریزی مسدود ہوئی۔ تیسری یہ کہ تنخواہ سو روپیہ ماہوار جو آپ ازراہِ قدردانی کے مرزا مرحوم کو ارسال فرماتے

تھے۔ وہ بھی یک لخت موقوف ہوئی۔ اب تک قرض لے کر اوقات بسر کی۔ اب قرض بھی نہیں ملتا۔ نوبت فاقہ کشی کی پہنچی ......"

بیگم صاحبہ اپنے شوہر کی روش کے خلاف، مذہبی خیالات کی تھیں۔ انہیں اس ہجوم مصائب میں بھی اپنی تکالیف سے زیادہ اس امر کا خیال تھا کہ کسی طرح مرزا صاحب کا قرضہ ادا ہو جائے۔ تاکہ وہ عذاب اُخروی سے محفوظ رہیں۔ اسی درخواست میں وہ آگے چل کر لکھتی ہیں:۔

"اب دعاگو کی یہ تمنّا ہے کہ ایسی پرورش بجہ ضعیفہ کی ہو جائے۔ کہ مرزا مرحوم حق عباد سے بری ہو جائیں۔ کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صورت ادائے قرض فرما دیں۔ تو کمال ثواب عظیم ہوگا۔"

مرزا کی خاندانی پنشن کے متعلق یہ امر تعجب انگیز ہے کہ اسے کیوں یک قلم بند کر دیا گیا بیوہ کو پوری نہ سہی اس کا کچھ حصّہ تو ملنا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے بیگم صاحبہ نے درخواست کی تھی کہ مرزا صاحب کی پنشن ان کے پسر متبنّٰی حسین علی خاں کے نام منتقل کر دی جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ ہمدردانہ کی۔ لیکن کمشنر نے حکم دیا کہ حسین علی خاں کے نام پنشن نہیں جاری ہو سکتی۔ البتہ بیوہ کو دس روپے ماہوار وظیفہ مل سکتا ہے بشرطیکہ وہ کچہری میں حاضر ہو۔ بیگم صاحبہ نے یہ رقم اور یہ شرط قبول نہ کی۔ اور ان حالات میں وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ خود مندرجہ بالا عرضداشت میں نواب رامپور کو لکھتی ہیں:۔

"ادھر پنشن میری دس روپیہ انگریز کرتا ہے۔ بشرطیکہ کچہری میں

حاضر ہوں۔ اور جانا میرا کچہری میں ہرگز نہ ہوگا۔ گو فاقوں ہی مر جاؤں کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کر دوں اور جو عزت اور ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے تھی حضور پر سب روشن ہے۔"

مولوی امتیاز علی عرشی کا بیان ہے کہ غالب کی وفات کے بعد نواب خلد آشیاں نے چھ سو روپے غالب کا قرضہ ادا کرنے کے لیئے عنایت کیئے اس کے علاوہ حسین علی خاں رام پور میں بصیغہ شعرا ۲۵ روپے ماہوار پر ملازم ہوگیئے۔ جس سے اس آفت زدہ خاندان کا بوجھ تھوڑا بہت ضرور ہلکا ہوگیا ہوگا۔ قرضے کی ادائیگی اور امراؤ بیگم کی ضروریات کے لیئے ان کے چچا زاد بھائی اور مرزا کے عزیز شاگرد نواب ضیاء الدین نیر درخشاں اور ان کے بھائی نواب لوہارو نے مدد کی۔ مولینا مہر لکھتے ہیں ہے

"نواب سراامیر الدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے قرضخواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی تھی اور امراؤ بیگم کے لیئے پچیس روپیہ یا پچاس روپے ماہوار لوہارو سے مقرر ہو گیئے۔ جو تا دم وفات انہیں باقاعدہ ملتے رہے۔"

اس سے پہلے بھی جب غدر کے بعد مرزا کی پنشن اور قلعہ کی تنخواہ بند ہوئی تھی۔ تو نواب ضیاء الدین نے ہمت اور جوانمردی سے کام لیا۔ اور امراؤ بیگم کے لیئے پچاس روپے ماہوار کا انتظام کر دیا۔ مرزا کو بھی اس کی توقع تھی۔

اور آخری ایام میں جب انہیں اپنے وابستگان کا خیال مضطرب کرتا تو وہ دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ بیوی کے لواحقین اسے بھوکا نہیں مرنے دیں گے۔ وہ نواب امین الدین رئیس لوہارو کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے۔ اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں۔ اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے۔ اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ کہ تم جیتے رہو۔ اور میں تم دونوں (نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین) کے سامنے مرجاؤں۔ تاکہ اگر اس قلفلے کو روٹی نہ دو گے۔ تو چنے تو دو گے۔ اور اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے۔ تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے ان غمزدوں کے غم میں نہ الجھوں گا!"

مرزا کی وفات کے بعد ریاست لوہارو کی طرف سے مرزا کی بیوہ کیلئے پنشن مقرر ہوگئی تھی۔ لیکن انہیں وہ بہت دن لینی نصیب نہ ہوئی۔ مرزا کی وفات ۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ کو ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سال بعد عین ان کی برسی کے دن امراؤ بیگم بھی اپنے رفیق حیات سے جا ملیں۔

جب مرزا کی وفات ہوئی۔ تو ان کی کوئی اولاد زندہ نہ تھی۔ ان کے پیچھے بعد دیگرے سات بچے پیدا ہوئے۔ لیکن سبھی کمسنی میں وفات پا گئے۔ عارف کے جن بیٹوں کو انھوں نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ وہ بھی عارف کی طرح جوانی میں انتقال کر گئے۔ مرزا کی وفات کے چند سال بعد اس تمام گھر کا صفایا ہو گیا اور ان کی کوئی

ظاہری یادگار باقی نہ رہی۔ لیکن جس قدر اولادِ ظاہری میں مرزا قسمت کے ہیٹے تھے اسی قدر فرزندانِ معنوی میں خوش نصیبا تھے۔ انھوں نے شعروادب کے جس باغ کی آبیاری کی تھی۔ وہ ابھی تک بہار پر ہے اور جب تک اردو زبان اور ہندوستانی ادب باقی ہے اس باغ میں خزاں کو بار نہیں ؎

خیرا ندیم سخنہائے محبّت بیار　　را ندیم سخنہائے محبت بیار
رفتیم آخر زعالم و درعالم　　ماندیم سخنہائے محبّت بیار

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

1972